

آسیہ رزاقی

یہی آرزو تھی

ناولٹ

مجھے اس بات سے سخت نفرت ہے کہ کسی کو بلاوجہ شک کیا جائے۔ محض قیاس کی بنیاد پر غلط رائے زنی کی جائے' یا گھٹیا الزامات عائد کر کے موضوع گفتگو بنایا جائے۔ اس لیے مجھے ایسے شخص سے نفرت ہو جاتی ہے جو محض اپنی ذہنی گندگی کسی پر کیچڑ اچھالے ہوتے ہوں گے ایسے بھی لوگ جو پروا نہ کرتے ہوں گے۔ مگر کردار کی پاکیزگی پہ چھینٹے اڑانے والوں کو میں معاف نہیں کر سکتی۔ مجھے فخر ہے کہ میرا دامن شفاف ہے۔ بے داغ ہے۔ میرا ذہن پاکیزہ خیالات سے منور ہے۔ جس کا عکس میرے چہرے پر بھی روشنی بکھیرتا ہے۔ پھر کسی کو کیا حق کہ وہ اپنی بدنسی کا نشانہ مجھے بنائے۔

جب چچی اماں کی بجائے [illegible] سکندر کی اماں نے اپنے شبہات کا اظہار کرتے ہوئے میرے خلاف ہرزہ سرائی کی تو میرے بدن میں نفرت کی آگ سی لگ گئی۔ میں نے اس آگ کو بجھایا نہیں' نفرت کو چھپایا بھی نہیں اور سکندر کے رشتے سے انکار کر دیا۔ سکندر کی والدہ جو بڑے یقین سے میرے لیے رشتہ لے کر آئی تھیں۔ [illegible] کا انکار ہو کر [illegible] سکندر [illegible] اپنی ہتک کا بدلہ تو لے لیا لیکن سکندر بہت مایوس ہو گئے۔

ٹھیک ہے وہ بہت سنجیدہ' بلند اخلاق اور باکردار انسان تھے۔ مجھے ہر لحاظ سے پسند تھے اور وہ بھی مجھے چند خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔ انہیں میری آنکھوں میں ذہانت اور میرے چہرے پر پاکیزگی کا نور نظر آ گیا تھا۔ میں ہی ان کے معیار پر پوری اترتی تھی ورنہ خاندان اور خاندان کے باہر حسین و جمیل لڑکیوں کی کمی نہ تھی۔ اسی لیے چچی اماں کی تائید پر انہوں نے اپنی والدہ کو چچا ابا کے پاس بھیجا تھا۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جب ان کا پیام میرے لیے آئے اور چچا ابا مجھ سے رائے طلب کریں۔ میں انہیں مسترد نہیں کروں گی۔

انہیں اور مجھے بھی قوی امید تھی کہ چچا ابا اس



رشتے کو منظور نہیں کریں گے۔ ہمارے گھرانے میں شادی کے لیے لڑکی سے منظوری لینے کا رواج تھا۔ لیکن آخری فیصلہ بزرگ ہی کرتے تھے۔ بہت کم ایسا شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ لڑکی کے انکار کے باوجود بزرگ اپنی دور اندیشی اور تجربے کی بنیاد پر اس کی پروا کیے بغیر اگر مناسب سمجھتے تو رشتہ طے کر دیتے تھے۔ مجھے بھی لڑکی کی اطاعت کے اظہار میں اقرار کرنی تھی گو مسترد بھی کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بی زبان سے سکندر سے کہہ دیا تھا کہ میرے اقرار انکار سے خاص فرق نہیں ہو گا چچا ابا جیسا مناسب سمجھیں گے کریں گے۔

لیکن سکندر میری خوشامد کرنے لگے کہ میں ان کے حق میں فیصلہ دوں۔ بعد کی بات قسمت کے ہاتھ ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر چچا ابا نے انکار بھی کر دیا۔ تب بھی وہ قیامت تک میرا انتظار کریں گے۔ کیونکہ میں ان کی زندگی کا نشان ہوں اور جیسی خوبیاں اور حسن و جمال وہ اپنی شریک حیات میں چاہتے ہیں وہ سب مجھ میں موجود ہیں۔ اتفاق سے ان کے بارے میں میرا بھی یہی خیال تھا۔ اسی لیے میں نے سوچ لیا تھا کہ انہیں ٹھکراؤں گی نہیں۔ لیکن آخری فیصلہ تو چچا ابا کے ہاتھ میں تھا۔

میں دل ہی دل میں بہت خوش تھی کہ سکندر سا شریک حیات۔ میری خوش نصیبی کی علامت تھا۔ لیکن سکندر کی والدہ نے خود ہی اپنے بیٹے کے راستے میں کانٹے بچھا دیے میرا تو اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ انہوں نے مجھے عثمان کے ساتھ مبہم کرنے کی کوشش کی اور چچی اماں سے وضاحت چاہی۔ ان کا خیال تھا کہ والدین کے انتقال کے بعد اپنے ماموں کے ساتھ نہ جا کر چچا ابا کے ہاں رہنے کا فیصلہ میں نے عثمان کی خاطر کیا تھا۔ اسے پھانسنے کے لیے

افواہ وہ بھی بے بنیاد اور مضحکہ خیز۔ میں نے ان کی ساری گفتگو سن لی۔ چنانچہ ان کی پست ذہنیت پر لعنت بھیج کر میں نے سکندر کے تصور سے خود کو آزاد کر لیا۔ جس کی ماں کے خیالات اتنے گھناؤنے ہوں۔ وقت سے پہلے جو میرے بارے میں ایسا خیال رکھتی ہیں تو بعد میں۔ اور ممکن ہے سکندر نے بھی ان کی ذہنیت کا کچھ اثر لیا ہو اور بعد میں اس کا اظہار ہو۔ تب؟ میں اتنی بھی تجربے کار نہیں کہ کسی کی ذہنیت کو پرکھ سکوں۔

سکندر اپنی پھوپھی یعنی میری چچی اماں کے گھر کبھی کبھی آتے تھے۔ میں ان سے بے تکلف تھی۔ مگر اتنی نہیں کہ ان کے دل میں جھانک سکوں اور جس گھر میں ان کی ماں جیسی خراب ذہن کی مالک رہتی ہو۔ وہاں مجھے سکون و اطمینان ملنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ کم از کم میری فطرت سے بعید تھا کہ دل میں غبار ہو اور مسکرائے۔ ایسی منافقت مجھ سے نہیں ہو سکتی اور سکندر کو دھوکا دینے کا تصور بھی ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے سیدھا صاف انکار ہی بہتر تھا۔ چچا ابا نے انکار کو تسلیم کر لیا۔

سکندر اور ان کی والدہ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ وہ بہت دل برداشتہ ہوئیں۔ رضیہ آپا نے سکندر کا سوال مجھ تک پہنچایا کہ میں نے ان کے ساتھ یہ دھوکا بازی کیوں کی۔ [illegible] کرا دی [illegible] اب لیکن [illegible] ان کے گھر جاتی اور ان کی ماں سے دل میں نفرت کرتی اور ان سے پوچھتی۔ ظاہر ہے کوئی بیٹا ماں سے نفرت کرنے والوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ سوائے چپقلش کے کیا حاصل ہوتا۔ ویسے اس انکار میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ آخر سکندر کی والدہ نے مجھے اتنا ذلیل کیوں سمجھا۔ یہاں آ کر چچی اماں سے صفائی [illegible] پہلے اپنے شکوک کا اظہار بیٹے سے کیوں نہ کیا۔ یہ میری شخصیت کی توہین تھی۔ میری عزت نفس اور انا کا سوال تھا۔ تمام عمر دل جلانے سے بہتر تھا کہ چند روز تکلیف سہہ لی جائے۔ اس فیصلے سے افسوس تو مجھے بھی ہوا ہی تھا۔

عثمان نے مجھے بہت پھٹکارا۔

"تم انتہا درجے کی کمینی ہو۔"

جب اس نے بک بک کر کے میرے کان کھا لیے تو

میں نے بھی زبان سے اسے بتا ہی دیا۔ کہ وجہ کیا تھی۔

"دیگر سکندر بھائی کا اس میں کیا قصور تھا؟" وہ میرے جواب سے مطمئن نہ ہوا۔

میں اسے کیسے بتاتی کہ ان کا یہ قصور کیا کم ہے کہ وہ اس ماں کے بیٹے ہیں۔ جس نے میرے کردار پر شک کر کے میری توہین کی تھی اور اپنے شک کے باوجود رشتہ لے کر آئی تھیں۔ میں ساری زندگی ان کے اس شک کو دور نہیں کر سکتی اور دیے ہوئے ان کے غلط قسم کے الفاظ اور الزام سے مجھے ان سے نفرت ہو گئی اور وہ نفرت میں چھپا سکوں گی نہ مٹا سکوں گی۔

"کہاں کی حور پری ہو جو اس قدر غرور ہے۔ ایمان سے کوئی نہیں پوچھے گا بھی نہیں۔ یہ تو ابا کی مہربانی ہے تم پر کہ تمہاری بات مان لی۔ ورنہ اپنی بیٹی ہوتی تو کبھی نہ مانتے۔ وہ سکندر بھائی کو بہت پسند کرتے ہیں جو ارادہ کر لیں۔ پھر اس سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ خوش قسمت ہو تم۔"

"مجھے معلوم ہے۔ چچا ابا اصولوں کے سخت ہیں۔"

"صفیہ آپا کی شادی کس طرح ہوئی کہ نہ صفیہ آپا [illegible] چچی اماں۔ چچا ابا کے فیصلے پر [illegible] تھا۔ ان کی شادی ہوئی اور اب صفیہ آپا بہت خوش ہیں۔ چچا ابا کہتے ہیں [illegible] کہ قسمت پھوڑ دیں۔ ہم سوچ سمجھ کر دور اندیشی سے فیصلے کرتے ہیں۔"

رضیہ آپا کا نکاح ایک زمیندار کے بیٹے کے ساتھ ہوا تھا۔ جو نکاح کے فوراً بعد کینیڈا چلا گیا۔ کئی سال بعد آیا تو غیر ملکی رنگ میں رنگا ہوا۔ اس نے رضیہ کی رخصتی سے بھی انکار کر دیا۔

چچا ابا کو معلوم ہوا تو وہ رضیہ کو لے کر خود ہی ان کے گھر چلے گئے حویلی کے بیرونی حصے میں جہاں نوکروں کے کوارٹر تھے رضیہ کو ایک کوارٹر میں بٹھا کر اندر چلے گئے اور لڑکے کے باپ سے بولے۔

"تمہاری بہو باہر بیٹھی ہے۔ اگر کچھ غیرت ہے تو اسے اندر لے آؤ ورنہ وہ نوکروں میں ہی عمر گزار دے گی۔ مگر اپنا حق نہیں چھوڑے گی۔ یہ تمہارا فرض تھا کہ تم اسے میرے گھر سے رخصت کرا کے لاتے۔ مگر میں خود اسے تمہارے گھر لے آیا ہوں۔ کیونکہ وہ تمہاری امانت تھی۔ اب اپنے بیٹے سے کہو اسے عزت کے ساتھ گھر کے اندر لے جائے اگر اس کی مرضی نہیں ہے تو اس پر جبر بھی نہیں کیا جائے گا۔ مگر اب میں رضیہ کو گھر واپس لے جا کر اپنی ذلت نہیں کر سکتا۔ میرے گھر میں اس کی جگہ نہیں ہے۔"

رضیہ کے میاں امان کو اس کے باپ بھائی شرمندہ کر رہے تھے۔ وہ خود رضیہ کو لینے دوڑے آئے۔ مگر رضیہ ان کے ساتھ نہیں گئی وہ دوپٹے میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔ وہ کھرے پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی تھی اور گھر کی خواتین اس کے ارد گرد کھڑی تھیں۔ ان کے خاندان میں پردے کی پابندی تھی۔ دیہاتی زمیندار گھرانہ تھا۔ خواتین کا گھر سے باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر بہو کو بیعت کروا کے رضیہ کی ساس نندیں کوارٹر میں آئیں تاکہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں لیکن رضیہ نے سر اٹھا کر دیکھا تک نہیں صرف ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔

شام سے رات ہو گئی تھی۔ بغیر کھائے پیے وہ ایک ہی انداز میں پلنگ پر بیٹھی تھی۔ ساس نند واپس گئیں سب لوگ امان کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا اور شرمندہ تھا۔ اسے سب سے زیادہ ندامت چچا ابا کی موجودگی سے ہو رہی تھی۔ جو بیٹھک میں بیٹھے ملکی سیاست اور زمینداروں کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے نافرمان اور گستاخ بھی نہ تھے کہ منہ پر ٹکا سا جواب دے دیتے۔

دن گزرا جا رہا تھا اور اب انہیں رضیہ پر بے حد غصہ بھی آ رہا تھا۔ کہ ساس سسر کے بلانے پر کیوں نہیں آئی۔ سہ پہر کو چچا ابا نے واپسی کا اعلان کیا اور پکار کر کہا۔

"امان میاں! رضیہ میری بیٹی ہے اور میرا ظرف سب پر آشکار ہو گیا ہے۔ اگر دن کے اجالے میں چار لوگوں کی موجودگی میں اندر لے کر نہیں جاؤ گے تو رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ ساری رات اسی طرح اسی

جگہ گزار دے گی۔ جہاں دن گزرا ہے۔ میں تو اب جاتا ہوں۔ خیال رہے۔ میرے گھر سے وہ عزت کے ساتھ اپنے باپ کے ہمراہ آئی ہے۔ اب تمہاری غیرت اور عزت کی آزمائش ہے۔"

امان کے والد نے فوراً کہا۔ "بھائی صاحب بیٹی بھی ہماری ہے۔ عزت اور غیرت بھی ہماری خاندان کی آن اور آبرو بھی ہماری ہے۔ مگر میں اب اس معاملے میں نہیں بولوں گا۔ امان کے خون میں شرم ہے تو وہ خود جا کر اپنی بیوی کو لائے گا ورنہ میں سمجھ لوں گا۔ اس خاندان سے غیرت شرافت، عزت، نجابت، مروت صداقت سب کچھ رخصت ہوا۔"

امان پہلے ہی بوکھلائے ہوئے تھے۔ کینیڈا کی آب و ہوا کا ملمع اتر رہا تھا' سوچ رہے تھے رات ہونے پر چپکے سے جا کر رضیہ کو لے آویں گا۔ ہر طرف کی پھٹکار کے بعد سسر کے سامنے جانے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ چچا ابا کے اعلان کے بعد رضیہ رات کو چوروں کی طرح نہیں جائے گی اور بھی گھبرا گئے۔ گھر والوں کی معنی خیز نظریں ان کے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں۔ سر جھکا کر باہر آئے ... رضیہ کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ حصہ نوکروں کے لیے مخصوص تھا۔ مرد نوکر تو صبح سے ہی ادھر نہیں آئے تھے۔ عورتیں اور بچے رضیہ کے پاس تھے۔ امان ہوئے کھڑے تھے۔ رضیہ کس سے جھینپی ہوئی۔ مردانے میں خبر پہنچی کہ امان رضیہ کو لینے گئے ہیں۔ چچا ابا نے باہر نکل کر پکار کر کہا۔

"رضیہ بیٹی! امان میاں تمہیں لینے آئے ہیں بے کھٹکے ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ اسی میں تمہاری عزت ہے۔"

امان نے ہاتھ بڑھایا۔ رضیہ نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں آہستہ آہستہ حویلی کی جانب چلے۔ دروازے پر امان کی ماں، بہنیں، بھاوجیں ان کے استقبال کو کھڑی تھیں۔ عزت و سرخ روئی کے ساتھ رضیہ اپنی سسرال میں ٹھاٹ سے حکومت کر رہی تھی۔ چچا ابا "حق بہ حقدار رسید" کے قائل تھے۔ امان برسوں گزر جانے کے بعد اب تک چچا ابا سے شرمسار تھے۔ بے حد نادم تھے۔

چچا ابا کہتے تھے۔ "اصول اصول کی بات ہوتی ہے، کوئی اصول کی بنیاد پر مجھے شکست دینا چاہے۔ میں بارہا مان لوں گا۔ اصولوں سے ہٹ کر کسی کو نہیں سنوں گا۔"

رضیہ کی انوکھی رخصتی اصول کی بنیاد پر تھی۔ یہ واقعہ مہینوں قرب و جوار میں مشہور رہا۔ میرا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ اول تو یہ کہ میں ان کی بیٹی نہیں بھتیجی تھی اور میری یتیمی کے باعث چچا ابا مجھے بہت زیادہ چاہتے تھے۔ میری ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ میرے لیے ان کے سخت اصولوں میں لچک ہو جایا کرتی تھی۔ کئی بار میں نے آزمایا تھا۔ اپنی بیٹیوں کی بہ نسبت وہ مجھے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ جو بات فوزیہ اور سعدیہ خوشامدوں سے بھی نہ منوا سکتی تھیں۔ میرا ایک بار کا کہنا کافی ہوتا۔ چچا ابا فوراً "مان لیتے۔

عثمان کہتا۔ "زیب! ابا کی ٹھیک ٹھاک چچی ہے چمکیلی پالش شدہ۔"

میں چپ ... تھی۔ چونکہ مجھے چچا ابا کی کسی بات سے اختلاف نہ ہوتا تھا۔ اس لیے عثمان چڑتا تھا۔ وہ اصولوں کا چرچا زیادہ کرتے تھے۔ ورنہ کوئی غیر معمولی بات وہ نہیں کرتے تھے۔ دور اندیشی، تجربہ اور اخلاق پر ان کا یقین تھا۔ وہ انسانیت کے زبردست حامی تھے۔ عثمان کا خیال تھا۔ چچا ابا اپنے خیالات ... زبردستی ... اپنے فیصلے ... جبر منوا سکتے ہیں۔ حالانکہ مجھ پر تو وہ کبھی جبر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ میں تو گھر بھر کی سفارشی تھی۔

ماما کو تنخواہ بڑھوانی ہے۔ تو میں ہی چچا ابا سے اس کی سفارش کروں۔ عثمان دوستوں کی دعوت کرنا چاہتا ہے۔ تو میں اجازت دلواؤں۔ سعدیہ کو سہیلی کے گھر جانا ہے یا ایسے ہی مسائل میرے ذریعے طے ہوتے۔ بجائے میرا احسان ماننے کے وہ طنز پر اتر آتا۔ اس سے پہلے بھی کئی رشتوں کے سلسلے میں میں نے انکار کیا تھا اور چچا ابا نے میری رائے کا احترام کیا تھا۔ چچا ابا مجھے چاہتے تھے۔ قدر کرتے تھے۔ وہ میری ذہانت کے قائل تھے۔ عثمان کا کہنا تھا "تمہاری کم عقلی کے سامنے ان کی بوڑھی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے تم سمجھتی ہو۔ وہ تمہیں ذہین سمجھتے ہیں۔" میں اس کی بک بک کی عادی تھی۔ اس لیے چپ رہتی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"خدا خیر کرے۔ معاملہ گمبھیر نظر آتا ہے۔" عثمان فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔ "کہیں کوئی دل میں تو نہیں بسا لیا۔ ہر رشتے سے انکار ہو رہا ہے۔ دال میں کالا نظر آ رہا ہے مجھے۔"

"دال میں سفید بھی ہو سکتا ہے۔" میں لاپروائی سے بولی۔

"نہیں، سچ بتاؤ یہ قصہ کیا ہے؟ بھئی۔ اب تم بھی اچھی اور نیک لڑکیوں کی طرح لال کپڑے پہن کر ، چھم چھم سجا کر سسرال جاؤ۔ کچھ ڈھول ڈھماکا ہو۔ رونق میلہ لگے۔ ڈولی سجے۔ ہم ڈولی کو کاندھا دے کر تمہیں منزل پر پہنچا آئیں۔"

"کیا بہت تنگ ہو؟" میں نے پوچھا۔ وہ سر کھجانے لگا۔ میرے سنجیدہ لہجے سے ڈر گیا۔ پانچ بہنوں کا بھائی، لاڈلا۔ ضدی۔ منہ زور۔ مسخرا، ہنس مکھ۔ ابھی تک بعض باتوں میں بالکل بچہ تھا۔ میں اسے نادان سمجھ کر درگزر کرتی تھی۔ مگر عثمان کی والدہ کو پتا نہیں کیا نظر آیا تھا۔ عثمان مجھ سے ڈھائی سال بڑا تھا۔ لیکن اپنی لاابالی طبیعت کی وجہ سے بعض لوگ اسے مجھ سے چھوٹا سمجھتے۔ اتنا اوٹ پٹانگ لڑکا تھا کہ بس۔ اس قدر بکواس کرتا کہ کانوں میں انگلیاں ڈال کر بیٹھنا پڑتا۔ نت نئی خبریں سنانے کا اسے جنون تھا۔ سارا دن دوستوں کے ساتھ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھرتا۔ شام کو گھر میں گھستا تو کسی نئی خبر کے ساتھ۔

"ارے لوگو سنو۔ کچھ سنا؟" وہ پکارتا ہوا بوکھلایا ہوا اندر آتا۔ "بھئی، جتنی چیزیں خریدنی ہوں خرید کر رکھ لو۔"

"ہے ہے۔" حجن بوا ڈر کر بول پڑتیں۔ "کیوں میاں؟ جنگ چھڑنے والی ہے کیا۔" حجن بوا دونوں

جنگوں سے نبٹ چکی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم، دوسری جنگ عظیم۔

"گھی مہنگا ہونے والا ہے۔" وہ جیسے بم کا گولہ دے مارتا۔

"تو میاں! اب چیزیں کیوں؟ گھی ہی منگالیں۔ بس۔"

"بوا، جب گھی مہنگا ہوگا تو مٹھائی اور ساری گھی کی بنی ہوئی مصنوعات مہنگی ہو جائیں گی۔ لوگ خریداری کم کردیں گے۔ مٹھائی کی خریداری کم ہو گئی تو چینی کی کھپت کم ہو جائے گی۔ چینی کے تاجر اپنا نقصان پورا کرنے کے لیے چینی مہنگی کریں گے۔ چینی مہنگی ہوئی تو گھروں میں چائے پر پابندی لگے گی۔ چائے کم فروخت ہوگی۔ تو پتی کے دام بڑھ جائیں گے۔ بس اسی طرح ہر چیز آسمان سے باتیں کرتی نظر آئے گی۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں سب چیزیں منگا کر رکھ لو۔"

"اوئی بوا۔" بوا دہل کر رہیں۔ انہیں مہنگائی سے خوف آتا تھا وہ گھر بھر کو الگ الگ تفصیل سے آگاہ کرتیں۔

"تم ایک بات بھول گئے۔" میں نے کہا۔ "ذخیرہ اندوزی کے جرم میں، میں تم کو حوالات کی سیر بھی کرا سکتی ہوں۔"

"ہاں ہاں، جانتا ہوں۔ تم ہو میری دشمن۔" وہ چڑ جاتا۔

"لو بھئی۔ آدھا شہر کھد گیا۔" اس نے آتے ہی یہ اطلاع دی۔ "اب پتا ہے کیا ہوگا؟ ڈاکٹروں کی کمی پڑ جائے گی۔"

"اللہ خیر۔" بوا نے سینے پر ہاتھ مار کر دہل گئیں۔ "میاں! کیا جنگ ہونے والی ہے؟"

"سیوریج لائن بچھائی جا رہی ہے۔ ایمان سے جدھر جاؤ سڑکیں کھدی پڑی ہیں۔ اب ڈاکٹروں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ زینب! تم نے پچھلے دنوں ڈاکٹر کے رشتے کو ٹھکرادیا۔ اب پچھتاؤ گی۔ سچ دولت مند ہو جائے گا اور بھی۔"

"بنے بنے میاں! پھر بتائیے تو ہوا کیا؟"

"حادثے، بوا حادثے۔ سڑکیں جابجا کھدی ہوئی ہیں۔ رات برات اندھیرے میں تم جیسی یا مجھ جیسا عقل کا اندھا۔ یا کوئی پرانا کم روشنی والا رکشہ ٹیکسی بغیر دیکھے تیزی میں ان کھدی ہوئی سڑکوں کی خندقوں میں غڑاپ سے کود جائیں گے۔ بس پھر ڈاکٹروں کی ضرورت پڑ جائے گی۔ یہاں کے ڈاکٹر کم پڑ جائیں گے۔ کیوں نہ ہم امجد بھائی اور اسلام ماموں کو بھی بلوالیں۔ بیچاروں کے کچھ پیسے بن جائیں گے۔ کیوں امی! کیا خیال ہے؟"

وہ چچی اماں سے مخاطب ہوتا۔ وہ چپ چاپ کام میں مصروف رہتیں۔ بک بک سننے کی عادی جو تھیں۔

"آدمی کام اچھا نہ ہو تو بات تو اچھی کرے۔" میں نے بڑبڑا کر کہا۔ "کسی بزرگ کا قول ہے۔"

"کسی کنجوس کا ہوگا۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "تم ہی میرے خلاف زہر اگلتا ہے۔ میں جو کچھ کرتا ہوں۔ جواب میں اس کا ایک عدد قول میرے خلاف اچھال دیا جاتا ہے۔ کبھی تم، کبھی ابا جان۔"

[illegible] تھکا ہوا [illegible] کرسی پر بیٹھ گیا۔ "ایسا حادثہ تو نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔" چچی بوا کو اس کی سنائی خبروں سے بے حد دلچسپی تھی۔ [illegible] ہوئی۔

"ایک ٹرک ہوائی جہاز پر چڑھ گیا۔"

"ہیں۔" بوا کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "کیا جہاز اڑ رہا تھا آسمان پر؟"

"نہیں جی۔" وہ بھنا کر بولا۔ "زمین پر ہی تھا۔ وہ تو شکر کرو وہ ایک ماڈل تھا۔ ورنہ سینکڑوں جانیں ضائع ہوتیں۔"

"پھر جہاز کا ڈرائیور پکڑا گیا کہ نہیں؟" بوا غور کیے بغیر بولنے کی عادی تھیں۔ "ٹرک ڈرائیور بھی پکڑا گیا؟"

"ڈرائیور۔ [illegible] ٹرک بھی ماڈل تھا۔ انور خواجہ بناتا ہے نا پلاسٹر آف پیرس کے ماڈل۔" وہ [illegible] آگاہ کرنے لگا۔

مجھے اس کی ان اوٹ پٹانگ باتوں سے کوفت ہوتی

تھی۔ چچی اماں بھی چڑتی تھیں۔ وہ اسے کسی سنجیدہ کام کا مشورہ دینا نہ بھولتیں۔ میں بھی کئی بار اسے سمجھا چکی تھی کہ خدارا، بوا کو پاگل نہ بنایا کرو۔ سارا دن خیر مانگتی رہتی ہیں۔ ہر ایک کو اپنی سمجھ کے مطابق تمہاری عطا کردہ خبریں اپنے الفاظ میں سناتی ہیں۔ کہیں کوئی دل کا مریض ہو۔ وہ اچھل پڑتی ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ ان کی زبانی بیان کردہ خبر افواہ بن کر شہر میں پھیل جائے۔"

"خیر مانگنا تو بہت ہی نیک کام ہے۔ اس لیے تو تم ابا کی آمریت کے باوجود صحیح سالم بیٹھی ہو۔ بوا کی دعاؤں کا ہی اثر ہوگا۔ ان کا شکریہ ادا کرو۔"

"آج ایک صاحبزادی کو میں نے کچل دیا۔" ایک دن وہ حواس باختہ سا آیا اور یہ خبر ساتھ لایا۔ میں چپ رہی مگر بوا کے کان کھڑے ہو گئے۔

"میں نے انہیں ڈاکٹر اسلم کا پتا دیا۔ ممکن ہے زخمی ہو گئی ہوں۔"

"سچ سچ میاں؟" بوا گھبرا کر بول پڑیں۔ "بہت زخمی ہو گئی تھیں۔ ہڈی وڈی تو نہیں ٹوٹی؟"

"خوش قسمتی تھی [illegible] آج کل کی لڑکیاں [illegible] آسمان کو تکتے ہوئے چلتی ہیں۔"

"اللہ خیر۔ میاں! آپ کے تو چوٹ چپیٹ نہیں آئی؟"

مجھے بے نیاز کام میں مصروف دیکھ کر وہ میرے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا۔ "جیسے ہی میری ان سے ٹکر ہوئی، ستارے سے جھلملانے لگے وہ گر گئیں۔ پھر اٹھ کر معافی مانگنے لگیں۔" میں نے کہا۔ "محترمہ شکر کیجیے۔ میں کوئی موٹر کار نہ تھا۔ ورنہ آپ تو مجھے کچلنے کا پورا ارادہ رکھتی تھیں۔ میری ڈینٹنگ پینٹنگ پر تو ہزاروں کا خرچ آجاتا۔ اچھا جائیے۔ ڈاکٹر اسلم سے مرہم پٹی کروالیں۔"

"میاں کیا ہوا۔ کس کی مرہم پٹی۔ کون کچلا گیا۔ ہزاروں کا خرچا کیسے ہوا؟" بوا بھی کمال کی شے تھیں۔

"اچھا بک بک مت کرو۔ مجھے کام کرنے دو۔"

میں نے عثمان کو ڈانٹا۔ مگر وہ میری سنتا کب تھا۔

اس گھر میں جتنی محبت، شفقت اور توجہ مجھے ملی، میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ماں باپ کے علاوہ اور کون ایسی محبت کر سکتا ہے۔ میں بہت خوش قسمت تھی۔ چچا ابا ہی نہیں چچی اماں اور سعدیہ، فوزیہ کا التفات، عثمان کی توجہ، رضیہ آپا، رفیعہ آپا، صفیہ آپا مجھے فوزیہ، سعدیہ سے کم نہیں سمجھتی تھیں۔ اس کے علاوہ میرے ذہن پر کوئی دباؤ بھی نہ تھا۔ ابا کی چھوڑی ہوئی زمین کی میں تنہا وارث تھی اور زمین کی آمدنی ایک بینک میں میرے نام سے جمع ہو رہی تھی۔

کئی بار رضیہ آپا کی معرفت چچا ابا نے مجھ سے شادی کے لیے دریافت کیا۔ مگر اس گھر کی محبت اور لگاؤ اور نئے لوگوں سے تعلق کا خیال خوفزدہ کر رہا تھا لیکن ویسے میں نے اپنے بارے میں چچا ابا کو اختیار دے دیا تھا۔

سکندر نے شادی نہیں کی ان کی والدہ کو حالانکہ بہت جلدی تھی۔ مگر میرے انکار کے بعد یہ ذکر ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ سکندر نے اب اس گھر میں آنا ہی چھوڑ دیا۔ شاید میری وجہ سے۔ عثمان کا خیال تھا کہ وہ میرے نرم پڑنے کا انتظار کر رہے ہیں یا پھر اپنی ماں کی موت کا۔ تاکہ میں ان کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ میں نے تو عثمان کے سوا کسی پر اپنے انکار کی وجہ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن شاید سکندر کو اپنی ماں کی ذہنیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔

"عثمان! تم انہیں سمجھاؤ، میں فیصلہ بدلنے کی عادی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ خدا کرے ان کی ماں بھی زندگی پائیں اور اپنی پسند کی بہو لائیں۔ میں کسی کے لیے موت کی خواہاں نہیں۔"

"ہونہہ۔ بڑے دماغ کی بی بی کھو گئی۔ مگر میں جانتا ہوں۔ تم بھی انہی کی مخبر ہو۔ اسی لیے ہر جگہ انکار کرتی ہو۔"

"اس خیال میں بھی نہ رہنا۔" مجھے غصہ آگیا۔ "مجھے سکندر یا ان کی ماں کا خیال بھی نہیں آتا۔"

"تو پھر۔ خدارا۔ یہاں سے دفع ہونے کی کوئی

سپیل کرو۔ ہماری باری بھی تو آئے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"میری وجہ سے کیا رکاوٹ ہے؟"

"بالکل ہے۔ جھوٹ موٹ بھی اپنا نام لوں تو امی وہ مصیبتوں کی پٹاری کھولتی ہیں کہ بس۔ کہتی ہیں گھر میں لڑکی بیٹھی ہے اور لڑکا سہرا باندھے۔ یہ ہمارے گھر کا دستور نہیں۔ تم میری خانہ آبادی کے راستے میں روڑے اٹکا رہی ہو۔"

"بالکل نہیں۔ تم شوق سے خانہ آبادی کرو۔ مجھے کسی کے راستے کا پتھر بننے کی خواہش نہیں۔ میں چچی اماں سے تمہاری سفارش کروں گی۔"

ایک دن کالج سے آتے ہی اس نے شور مچایا۔

"آج کی تازہ ترین خبر کا خلاصہ سنیے۔ سابندولت کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔"

بوا فوراً موقع پر پہنچیں۔ "میاں فال بد نہیں نکالا کرتے بری بات۔" "بس صرف ریٹ کرالیے سیدھے سچ کہتا ہوں بوا۔" وہ سانس لینے لگا۔

"ہے ہے کوئی چوٹ لگ گئی کیا؟" بوا فکرمند ہو گئیں۔ انہوں نے عثمان کو گود کھلایا تھا۔ بہت چاہتی تھیں۔

"ہاں۔ بڑی سخت۔ زبردست۔ دل پر چوٹ لگی ہے۔ ایکسیڈنٹ بھی تو دل کا ہی ہوا ہے۔ سخت درد ہو رہا ہے۔"

"خدا نہ کرے۔ سچ کہے میاں۔ میرا جی گھبرانے لگا۔" بوا حسب معمول دل تھام کے۔

"بوا سچ بات تو یہ ہے کہ اس گھر میں میری تو کسی کو پروا ہی نہیں ہے۔ ایکسیڈنٹ ہو یا بیمار ہو جاؤں۔ دل ٹوٹے۔ تن چھلکے۔ مروں کہ جیوں۔ لوگ نظر اٹھا کر دیکھتے تک نہیں۔ تکیے کے غلاف میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ سوئی کی نوک میرے دل و جگر کے پار ہو رہی ہے۔ اس سے بھی غرض نہیں۔ دنیاداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ مگر جب میری قیمتی جان کی ہی کوئی قدر نہیں۔ تو دل ٹوٹے یا پھوٹے۔ دنیا جائے جہنم میں۔" وہ بے حد بدمزاج ہو رہا تھا۔ منہ پھلائے لیٹا تھا۔

"خدا کے لیے عثمان تم یہاں سے چلے جاؤ مجھے بہت کام کرنا ہے۔" میں نے عاجز آ کر لجاجت سے کہا۔

ایک تو فوزیہ کے اسکول میں مینا بازار تھا۔ دستکاری کے لیے فوزیہ کو میز پوش، تکیے کے غلاف، ٹی کوزی وغیرہ کا آرڈر اسکول کی جانب سے ملا تھا۔ فوزیہ نے تکیے کے غلاف میرے سپرد کر دیے اور آج ہی یہ مکمل کرنے تھے۔ شام کو رضیہ آپا کی منڈ وغیرہ کی دعوت تھی۔ باورچی خانے کی انچارج میں تھی۔ بی بی کی اور مجھے بہت گھبراہٹ تھی کہ کس طرح سب کام کروں گی۔ اوپر سے عثمان میرا دماغ چاٹنا چاہتا تھا۔ رات کو کھانے کے بعد جب سب مہمان چلے گئے۔ میں تھکن سے چور کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ عثمان پھر آ دھمکا۔ میں نے بیزاری سے کروٹ دیوار کی طرف لے لی۔ جانتی تھی اب وہ تفصیل اور اطمینان کے ساتھ میرا دماغ چاٹے گا۔ میں آرام کرنا چاہتی تھی۔

"زیادہ ... نہیں" بولا۔ "دیکھو جانتا ہوں۔ تم امی ابا کی چہیتی ہو مگر ہم آتے بھی غیر اہم ہوں کہ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتیں؟"

"عثمان! میں بہت تھک گئی ہوں۔ سر میں درد ہے۔"

"میں دبا دوں گا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اصل میں تمہیں ایک بڑی زبردست خبر سنانی ہے۔"

"تم روز ہی نئی خبریں سناتے ہو۔ میں تنگ آ گئی ہوں تمہاری بے پر کی سے۔"

"مگر یہ خبر معمولی نہیں ہے۔ خوش خبری ہے۔ بے پر کی نہیں۔ پر دار ہے۔ میں ایکسیڈنٹ کر بیٹھا ہوں۔" اس نے بڑے جذبے سے کہا۔

"کیا اسی دن والی لڑکی سے دوبارہ؟"

"گولی مارو اس دن کی لڑکی کو۔" اس نے بڑے جوش سے کہا۔ "یہ تو اس لڑکی نے میرا پتہ صاف کر دیا جس کو شامہ کہتے ہیں۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "ایں! کیا وہ حمیدہ پھوپھو کی لڑکی وہ فتنہ۔"

"ہاں ہاں وہی فتنہ، میرا دل اڑا کر لے گئی۔"

"عثمان! ذرا تمیز سے، تم گھر میں ہو۔ اپنے لفنگے دوستوں سے مخاطب نہیں ہو۔" مجھے طیش آ گیا۔

"تم بڑی آئیں کی تہذیب یافتہ ہو۔ اب آخر دل کی حالت کیسے بیان کروں۔ میں اتنا تجربے کار بھی نہیں پہلا حادثہ ہے۔"

"خدا کے لیے سنجیدگی اختیار کرو۔" میں نے سمجھایا۔

"ہوش سے نہیں ہوش سے کام لو۔ تمہیں معلوم ہے، حمیدہ پھوپھو شادی سے پہلے گھر سے کہیں چلی گئی تھیں۔ ماں باپ کی مرضی کے بغیر چپکے سے شادی کر کے آ گئی تھیں۔ تب سے سارا خاندان ان سے ناراض ہے۔ ہمارے خاندان کا یہ واحد اور انوکھا واقعہ ہے۔ شامہ کے والد کا خاندان بھی نچلے درجے کا ہے۔"

"تو ہوتے رہو۔ حمیدہ پھوپھو کا خاندان تو اعلیٰ درجے کا ہے۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں۔ دنیا کے سارے خاندان اللہ میاں کے بنائے ہوئے ہیں۔"

"مگر چچا ابا تو ان سے ملتے نہیں۔"

"جو بھی ہو۔ میں تو ملتا ہوں۔ اور شامہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔"

"بکواس۔ وہ بہت تیز ہے۔ الو بنا رہی ہو گی تمہیں۔ مغرور اور چھچھوری۔"

میرے منہ سے نکل گیا۔ عثمان سنجیدہ ہو گیا۔ گھنٹہ بھر بیٹھ کر اس نے مجھے قائل کرنے کی سر توڑ کوشش کی کہ شامہ کے بغیر وہ خوشگوار زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اس معاملے میں کسی مخالفت کی پروا بھی نہیں کرے گا۔ مجھے افسوس کے ساتھ تھوڑی سی خوشی بھی ہوئی۔ افسوس اس بات کا کہ عثمان نے اپنی شریک زندگی کے لیے جس لڑکی کو منتخب کیا وہ سراسر چچا ابا کے لیے دل اذیت کا باعث بنے گی۔ خوشی اس لیے کہ اس لاابالی اور غیر ذمہ دار لڑکے میں کچھ تبدیلی محسوس ہوئی۔ وہ سنجیدگی سے ایک ذمہ داری قبول کرنے پر تیار تھا۔ کاش اسے کوئی اچھی لڑکی پسند آئی ہوتی۔ جو باپ بیٹے کے درمیان کسی اختلاف یا تنازعہ کا باعث نہ بنتی۔ اب عثمان چاہتا تھا کہ میں چچا ابا سے اس کی سفارش کروں یا چچی اماں تک یہ بات پہنچا دوں۔ وہ چچا ابا کو ہموار کریں۔

ہمارا خاندان ابھی تک پرانی روایات کا حامل تھا۔ ہمارے ہاں غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لیے شادی بیاہ کا ذکر کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا نہ کہ کسی کی پسندیدگی کو اس کے والدین تک پہنچانا بڑی بے حیائی کی بات تھی۔ مگر عثمان کی خاطر میں نے یہ بے شرمی گوارا کر لی اور چچی اماں کو بتا دیا کہ عثمان شامہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

چچی اماں دنگ رہ گئیں۔ "دیوانہ ہوا ہے لڑکا۔" انہوں نے اچنبھے بھرے لہجے میں کہا۔ "اس سے کہو یہ خیال ذہن سے نکال دے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ماں نے چھپ کر شادی رچالی۔ باپ لادین ہو گیا۔ یہ کیا کم برائی ہے۔ میرے ایسی بات بھی نکالی تو وہ تو میری جان کھا جائیں گے۔ میں بھلا ایسی انہونی زبان پر لاؤں گی۔ توبہ کرو۔ ہائے کیسا زمانہ آ گیا ہے۔"

عثمان کا دل و دماغ قابو میں نہ رہا تھا۔ اس نے پھر خوشامد کر کے مجھے بھیجا۔ آخر چچی اماں نے اس سے خود بات کرنے کی ٹھانی۔ ہر طرح سمجھایا۔ چچا ابا کی مخالفت سے ڈرایا۔ مگر عثمان اپنی بات پر قائم رہا۔ آخر خودکشی سے ڈر کر چچی اماں نے عثمان کی بات چچا ابا تک پہنچا دی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس دن ایسا طوفان آیا۔ وہ ہنگامہ ہوا۔ الٰہی توبہ میں تو کمرہ بند کیے بیٹھی رہی۔ چچا ابا غصے میں بھرے تھے۔ انہوں نے عثمان کی خوب خبر لی۔ ان کے چنگھاڑنے کی آوازیں میرے کانوں تک پہنچیں۔ مگر میں کان بند کیے پڑی رہی۔ ایسے وقت میں سب کا یہی حال ہوتا ہے ورنہ جو بھی زد میں آ جائے، چچا ابا اسے چھوڑتے نہیں۔ ان کے چنگھاڑنے غرانے کی آوازیں میرے

کمرے کے دروازے تک ٹکرا کر لوٹ گئیں۔ بعد میں حجن بوا نے بتایا۔ چچا ابا کو شمامہ کے والد سے بات کرنا گوارا نہیں تو دست طلب دراز کرنے کا تو سوال ہی نہیں، حمیدہ پھپھو نے گھر کی دہلیز پار کر کے خاندان کی عزت پر جو سیاہ داغ لگایا تھا۔ وہ وقت گزرنے کے ساتھ زمانے کی تیز دھوپ میں اڑ کر ہلکا پڑ گیا تھا۔ لیکن اس کی سیاہی ہنوز باقی تھی اور چچا ابا؟ وہ تو ان معاملات میں بہت سخت تھے۔ انہیں شمامہ کے والد کی شرافت کا یقین نہ تھا۔ ان کی خاندانی نجابت پر بھی مشکوک تھے۔ بے غیرت تھے اور لامذہب بھی۔ انہوں نے جوانی میں حمیدہ پھپھو کو ورغلا کر گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کیا۔ پھر خفیہ شادی رچائی اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے واپس بھی آ گئے۔ گو کہ وہ تو اسے محبت کی فتح قرار دیتے تھے۔ شروع شروع میں خاندان والوں نے ان کا بائیکاٹ کیا۔ پھر رفتہ رفتہ ملنا جلنا شروع کر دیا۔ لیکن چچا ابا نے پھر حمیدہ پھپھو کی صورت نہیں دیکھی۔ یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا اور وہ پھر بھی نہیں گئے۔ کہہ دیا۔

"بیس برس پہلے وہ میرے لیے مر گئی تھی۔ جس دن اس نے گھر سے قدم نکالا تھا وہی دن اس کی موت کا تھا۔ کیا ہوا۔ وہ چار آدمیوں کے کندھے پر نہیں گئی زندہ جنازہ گیا تھا۔ اس وقت زندہ لاش تنہا گئی تھی۔ اب بھی میرے کندھے کی اسے ضرورت نہیں۔"

انہوں نے چچی اماں کے تقاضے پر کہا تھا۔ مگر اب ان کے بیٹے نے جو شوشہ چھوڑا تھا۔ اس کی آنچ سے وہ سلگ اٹھے تھے۔

"جس ماں کی گود میں اس لڑکی نے پرورش پائی ہے۔ اس نے ہماری عزت کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ اب یہ لڑکی ہماری آزمائش کے لیے جوان ہو گئی ہے۔ عثمان! ہم صرف اس لیے انکار کر رہے ہیں کہ وہ حمیدہ کی لڑکی ہے۔ جس نے عزت، غیرت، شرافت اور مذہب کی دیواریں پھلانگنے کی جسارت کی۔ اس کی آغوش میں پرورش پانے والی ہمارے لیے گالی بن کر آئے گی اور اگر تم ہمارے لیے۔ اپنے باپ کے لیے گالی ہی تجویز کر چکے ہو۔ تب بھی۔ اس گھر میں نہیں تم اور نہیں بھی گالی دو گے۔ ہم کان بند کر لیں گے۔ ہم موت کو گلے لگا لیں گے۔ مگر اس بے غیرت بے حمیت انسان کے پاس نہیں بیٹھیں گے۔ جس نے جوانی میں ہماری غیرت کو للکارا تھا۔"

چچا ابا سخت غضب ناک تھے۔ مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ یہی ہو گا۔ عثمان نے نادانی میں سوتے ہوئے شیر کو جگا دیا تھا۔ اس دن بھی عثمان بہت طیش میں پیر پٹخ رہا تھا۔ "ہونہہ بڑے شرافت کے ٹھیکیدار۔ میں بتا دوں گا۔ کیا کر سکتا ہوں۔"

مگر میں جانتی تھی۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ چچا ابا نے اسے عاق کرنے کی دھمکی دی تھی اور بغیر کسی سہارے کے دو قدم چلنا بھی اس کے لیے ناممکن تھا۔ ابھی تک تو بغیر ہاتھ پیر ہلائے اسے سب کچھ میسر تھا۔ اسے پتا بھی نہ تھا کہ چچا ابا گاؤں جا کر کیا کرتے ہیں اور کس طرح زمین کی آمدنی کی وصولیابی ہوتی ہے۔

"تم میری مدد کر سکتی ہو۔" اس نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔

"ارے ہوش میں آؤ۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"ابا تمہاری بات مان لیتے ہیں۔ اگر تم کہو گی تو۔"

"دماغ صحیح ہے؟" میں نے گھبرا کر کہا۔ "میں اور تمہاری شادی کی بات کروں گی؟ چچا ابا سے؟ اور وہ بھی شمامہ کی۔ کبھی نہیں۔"

عثمان میرے انکار کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھے برابر پٹی پڑھاتا رہا۔ یہ کہنا وہ کہنا۔ میں برابر انکار کرتی رہی۔ مگر اسے میرے انکار کی پروا نہ تھی۔ آخر کار اس نے مجبور کیا کہ میں انہیں خط کے ذریعے رضامند کروں۔ چند دلیلیں ایسی لکھ ماروں کہ وہ مان جائیں۔ مثلاً "یہ کہ حمیدہ پھپھو نے اسی آغوش میں پرورش پائی ہے جس میں چچا ابا پل کر بڑے ہوئے۔ دادی اماں کی تو تمام اولادوں کی شادیاں ہو گئیں۔ کہیں سے یہ اعتراض نہیں اٹھا کہ اس آغوش کی پروردہ لڑکیاں حمیدہ جیسی ہوں گی۔ پھر یہ تو کار ثواب ہے۔ شمامہ کی

بدنامی کے باعث اگر اس کے عزیز ہی دل اور گھر میں جگہ نہ دیں گے تو غیروں کو کیا پڑی ہے۔ اس کی زندگی تباہ ہوئی اور اس کا خون چچا ابا کی گردن پر ہوگا۔ وغیرہ۔

جب قلم میں نے ہاتھ میں پکڑا تو انگلیاں لرز رہی تھیں۔ مجھ سے ایک حرف نہ لکھا گیا اور سب کچھ چھوڑ کر قلم وہیں پھینک چانک عثمان کے پہنچنے چلانے کی پروا کیے بغیر میں چچی اماں کی پناہ میں آگئی۔ اگر میں نے کچھ لکھ دیا ہوتا۔ شامت تو میری آہی جاتی۔ پھر مجھے بچانے آتا عثمان بہت رنجیدہ تھا۔ مجھ میں اس کی قہر زدہ اور رنجیدہ صورت دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ مگر وہ پھر آگیا اور لگا مجھے طعنے دینے۔

"تم ابا کی چہیتی ہو۔ خود غرض ہو۔ میری خوشی کی تم کو پروا نہیں۔ ظالم ہو ابا کی طرح اور یہ کہ میں خودکشی کرلوں گا۔" وغیرہ۔

میں چپ رہی۔ جانے کس طرح یہ خبر چچا ابا تک پہنچی کہ عثمان مجھے سفارشی بنا کر ان کے پاس بھیجنا چاہتا ہے۔ چچا ابا صحن میں آگئے۔

"بلاؤ اسے۔" وہ چلائے "کہاں ہے بے غیرت۔ آ ادھر آ کرتا ہوں شادی۔ ضرور کروں گا۔ باپ کے مقابلے میں آتا ہے۔ عیاشی کی سوجھی ہے۔ ابھی کر شادی انکار کر سکتا ہے تو کر کے دیکھ۔ بلاؤ قاضی ہوں ہوں۔"

صاحب کو۔ میں یہ قصہ ابھی پاک کیے دیتا ہوں۔ چچا ابا چیختے رہے۔ میں چچی اماں کے پاس دبکی رہی۔ عثمان جانے کہاں تھا۔ اس کی تو آواز ہی سنائی نہ دی۔ بے حوصلہ پھر رات ہوگئی اور رضیہ آپا، صفیہ آپا بے وقت کیسے آگئیں۔ یہ پوچھنے والی ہی تھی کہ کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ سب نے مجھے چھیڑنا شروع کر دیا۔ میں حیران پریشان ایک ایک سے پوچھتی رہی کہ قصہ کیا ہے۔ لیکن سب نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر ہی میرا لباس تبدیل کر دیا۔ پھر مجھے خبر ہوئی گئی۔ عثمان کی بغاوت اور ضد سے تنگ آکر چچا ابا نے آج ہی میرا اس سے نکاح مقرر کر دیا ہے۔ قاضی صاحب آگئے تھے۔ کچھ عزیز آگئے تھے۔ کچھ آنے والے تھے۔ کسی کا انتظار کیے بغیر ہی نکاح پڑھا دیا گیا۔ میں آخری لمحے تک منتظر رہی۔ عثمان کے انکار کی خبر سنوں۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ میرا جسم سرد تھا اور میں بری طرح کانپ رہی تھی۔ رضیہ آپا مجھے سمجھا رہی تھیں۔ "عثمان کی بہتری کے لیے ابا نے یہ فوری قدم اٹھایا ہے اور ویسے بھی وہ چاہتے تھے کہ تمہیں بہو بنائیں۔"

پاگلوں کی طرح میں ایک ایک کا منہ دیکھ رہی تھی۔ عقل گم، حواس غائب گویا سلب ہو چکی تھی۔ اس قدر تیزی سے سب کچھ ہوگیا۔ نیم مدہوشی کی حالت میں مجھے عثمان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ الٰہی توبہ خدا کرے یہ خواب ہو۔ مگر میں تو خواب میں بھی ایسا تماشا بننا پسند نہ کرتی۔ رات گئے رضیہ آپا عثمان کو پکڑ کر لائیں اور پلنگ پر بٹھا کر سمجھانے لگیں۔ میں پہلے ہی مردے کی طرح اکڑی بیٹھی تھی۔ رضیہ آپا کے باہر جاتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ میں بھی بغیر جنبش دم سادھے بیٹھی رہی پھر میں نے اس کی آواز سنی۔ وہ رو رہا تھا۔ اچانک ایک طوفان میرے دل میں بھی انگڑائی لے کر اٹھا۔ طاقت ور طوفان نے میرے ضبط و برداشت کے بند توڑ ڈالے۔ بے قراری سے رونے لگی۔ وہ پلٹ کر میری جانب آیا اور نہایت تندی سے بولا۔

"تم کیوں رو رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ جشن منانا چاہیے اپنی فتح کا۔ تمنا تمہاری پوری ہوگئی ہے' زندگی تو میری برباد ہوئی ہے۔ بے موت تو میں مارا گیا ہوں۔ تم اور تمہارے چچا دونوں کامیاب ہوئے ہیں۔"

میں نے دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ بنا ہوا تھا اور آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ طیش اور ناکامی نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ کبھی ادھر جاتا' کبھی ادھر۔ پیر پٹختا ہوا۔

"اب سمجھ میں آیا۔ ہر رشتے سے انکار کا کیا سبب تھا۔" اس نے آنکھیں بند کیں، آنسو پونچھے۔

"اور وہ بزرگوار بھی کس لیے ہر انکار کے بعد صواد کرتے تھے۔ دونوں چچا بھتیجی مجھے شکار کرنا چاہتے تھے نا۔ میں قربانی کا بکرا جو تھا۔ تم کی منصوبہ بندی۔ میں بھی کیا بے وقوف بنا ہوں۔ خیر یاد رکھنا ایسا انتقام لوں گا کہ زندگی بھر رستی رہو گی اور۔"

میں چپ تھی۔ عثمان میری جانب سے برگشتہ تھا اور صفائی دینے کا کوئی موقع بھی نہ تھا۔ جانے عثمان کب تک بدگمانی کا شکار رہے۔ میں اپنی صفائی بھی دے پاؤں گی؟ ابھی تو وہ روٹھے بچے کی طرح پیٹھ موڑے کھڑکی کے سامنے کھڑا باہر اندھیرے میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ شاید اپنی خوشیاں۔ میں نے اٹھ کر قالین پر ایک چادر ڈالی ایک تکیہ رکھا۔ اپنا بستر تیار کر کے میں عثمان کی جانب گئی اسے چھوا۔

"کیا ہے؟" اس نے بھاری اور تلخ آواز میں مجھے جھڑکا۔

"رات بہت ہوگئی ہے۔" میں نے خجالت سے کہا۔ "آپ لیٹ جائیں۔"

اس نے پلٹ کر قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا اور چبا کر کہا۔ "میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمہاری ہمدردی میں میرا آرام بھی حرام ہے۔ میں تو تمہارے قریب رہنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ آیا سمجھ میں دغاباز۔"

دل میں اٹھتے درد سے گھبرا کر سینے میں ہی روک کر میں نے نرمی سے کہا۔

"میری وجہ سے تمہارا آرام حرام نہ ہوگا۔ کبھی نہیں۔" اور تیزی سے میں زمین پر بچھے بستر پر جا لیٹی اور جانے کب سو بھی گئی۔ عثمان بھی اپنے پلنگ پر سو گیا۔ اس دن سے اس کی زندگی کو بھی کسی کی نظر لگ گئی۔ ہنستا بولتا عثمان گویا باتیں، خبریں، بک بک اسے کچھ یاد نہ رہا۔

♥ ♡ ♡ ♥

ایک دن بوا جمن نے اس سے کہا۔ "میاں! بہت دن سے کوئی خبر نہیں سنائی آپ نے۔"

اس نے نہایت بے رحمی سے کہا۔ "سب سے بڑی خبر تو یہی ہے کہ عثمان کو زندہ دفن ہوئے پندرہ دن ہو چکے ہیں۔ مٹی ڈالنے کا فرض تو تم نے بھی ادا کیا تھا۔ بھول گئیں؟"

عثمان نے مجھے نظر انداز کر دیا جیسے میں ردی کاغذ ہوں۔ سگریٹ کا بجھا ہوا ٹکڑا یا ایش ٹرے میں بھری راکھ۔ میں ان لمحے بھی گئی گزری تھی۔ میں نے صبر کی سل سینے پر رکھ لی تھی اور خاموشی کو حرز جاں بنا لیا۔

ایک روز فوزیہ نے کہا۔ "بھیا! کوئی خبر سناؤ نا۔"

"اچھا کیا تم کو خبر نہیں۔" وہ بولا۔ "یہ خبر تو اب پرانی ہوگئی ہے۔"

"کون سی بھلا؟"

"تمہارے بھیا کی نیلامی کی خبر۔ تمہارے باپ نے اپنے بھائی کی جائیداد کے عوض اس کی خوشیاں نیلام کر دیں۔ اگر اس جائیداد کے تحفظ کے لیے انہیں میری جان لینی پڑتی تو اس سے بھی دریغ نہ کرتے پھر بھی یہ سودا سستا تھا۔ سستا تھا نا؟"

اس نے براہ راست مجھ سے پوچھا۔ عثمان کی زبانی یہ دل خراش بات سن کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ اور میں سوچنے لگی۔ کیا یہ سچ ہے؟ میری جائیداد کے حصول کے لیے عثمان کو۔ کیا وہ محبت اور قدر و قیمت اسی جائیداد کے لیے تھی۔ میری محبت نہ تھی؟ اس زمین کی تھی جس کی میں مالک تھی۔ عثمان نے کئی بار مجھے سنا کر کہا کہ وہ میری جائیداد پر لعنت بھیجتا ہے شادی سے پہلے وہ کہیں بھاگ بھی سکتا تھا۔ مگر ماں کی محبت اس کے قدموں کی زنجیر بن گئی۔

کبھی کبھی وہ نہایت کڑوے طنز سے کہتا۔ "آپ کا غلام حاضر ہے۔" شرمندگی سے میں پسینہ پسینہ ہو جاتی۔ کچھ کہنا چاہتی مگر زبان ساتھ نہ دیتی۔ یہ سچ ہے کہ اس کی خوشیوں کی میں قاتل بن گئی۔ اس کی مسکراہٹ کو میری نظر کھا گئی۔ ایک لاابالی کھلنڈرے لڑکے کی زندگی میں غم کا زہر گھولنے کی یہ سازش میرے سر تھوپی جا رہی تھی۔ کاش میں نے اپنی انا کے زعم میں سکندر کے لیے انکار نہ کیا ہوتا۔ چچا ابا سکندر کو بہت پسند کرتے تھے۔ چچی اماں کی سفارش پر وہ رضامند بھی تھے۔ مگر میرے انکار نے حالات کا رخ بدل دیا۔ اگر چچا ابا کو میری جائیداد کا لالچ تھا تو وہ سکندر سے شادی پر کیوں رضامند ہوئے؟ ممکن ہے یہ عثمان کی

غلط فہمی ہی ہو اور وہ اپنے اس خیال پر حق بجانب تھا کہ خمیازہ تو اسی کو بھگتنا پڑا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اب عثمان دن بھر گھر میں نہ آتا۔ نہ جانے کہاں جاتا تھا۔ کیا کرتا تھا۔ شاید اور بھی کسی نے دریافت نہ کیا۔ مجھ سے تو اسے سخت نفرت تھی اور وہ التفات بے تکلفی خواب بن گئی۔ شاید اسی لیے وہ گھر میں نہیں رہتا تھا کہ کوئی ہماری اس دوری کو نہ جان لے۔ ویسے اس کی اداسی کا سبب تو کسی سے چھپا نہ تھا۔ چچا ابا شادی کرا کے بے خبر ہو گئے۔ گھر کے اندر آتے تو مجھ سے نظر چراتے، براہ راست مخاطب نہ ہوتے۔ ممکن ہے عثمان کی بے زاری، گھر سے غائب رہنے کی وجہ مجھے سمجھ کر یا میری ہمدردی میں۔ میں تو بہرحال عثمان کی بربادی کو اپنی ذات کا نتیجہ قرار دیتی تھی۔ نہ میں ہر رشتے کو بلا سبب مسترد کرتی، نہ یہ حالات ہوتے۔ کاش اس وقت میں انکار ہی کر دیتی۔ مگر اچانک سب کے شور شرابے سے اس قدر حیران تھی کہ زبان بند ہو گئی تھی۔ کاش وہ کسی سے بھی شادی کر لیتا، میں تو سر اٹھا کر چلنے کے قابل رہتی۔ اب تو میں خود اپنی نظر میں بد ترین مجرم ہو کر رہ گئی تھی۔

چچی اماں کی شفقت میں کمی نہ آئی تھی۔ رضیہ آپا، صفیہ آپا، رفعہ، فوزیہ، سعدیہ سب ہی کا رویہ حسب معمول تھا۔ گھر کے تمام حقوق جو ایک بہو کے ہوتے ہیں مجھے حاصل تھے۔ نہیں تھا تو عثمان کا التفات۔ تعلیم ختم کر کے اس نے سروس کر لی تھی۔ مگر چچا ابا کی خواہش تھی کہ وہ اب زمین کی دیکھ بھال اور حساب کتاب سنبھالے۔ چچا ابا کا ہاتھ بٹائے۔ عثمان کھلم کھلا ان کی مخالفت کر رہا تھا۔ ملازمت کر کے وہ اپنے باپ کو باور کرانا چاہتا تھا کہ اسے زمین جائداد سے دلچسپی نہیں اور اسے اس آمدنی کی ضرورت بھی نہیں۔ چچی اماں بھی اس بات پر اس سے خفا ہو گئیں۔ میں نے چچی اماں کو سمجھایا تھا کہ ملازمت کوئی عیب نہیں۔ وہ خود اپنی پوزیشن بنانا چاہتا ہے اور حساب کتاب سے اسے کبھی لگاؤ نہیں رہا۔ زمینداری کی طرف اس کا رجحان ہی نہیں تھا۔ جبریہ آمادہ کر کے اسے اور بھی باغی اور خود سر بننے کا موقع دیا جائے گا۔ چچی اماں پہلے ہی شادی کر کے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے محروم ہو چکی تھیں اب زیادہ ضد دلانے سے ڈر گئیں۔

میں خوش تھی۔ عثمان کا لڑکپن اب سنجیدگی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جدوجہد کی زندگی میں قدم رکھ کر اس نے اپنی فلاح کی راہ ڈھونڈ لی تھی۔ اب وہ دنیا کے بازار میں قدم جما کر اپنا مقام بنا رہا تھا۔ رات کو چپکے سے آ کر لیٹ جاتا۔ کبھی بیمار ہوتا تو میں سر دبا دیتی، دوا کھلاتی۔ بیماری میں میری بات مان لیتا تھا۔ بچوں کی طرح۔ لیکن مخاطب ہونا یا میرے چہرے پر نظر ڈالنا اسے گوارا نہ تھا۔ میں ایسی دیوار تھی جس سے دوری ممکن نہ تھی۔ ایسی قاتل تھی جسے سزا دینا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ انتقام لے سکتا تھا۔ حقارت سے، نفرت کر کے۔ اور وہ کر رہا تھا۔

میں جو اس گھر کی بیٹی تھی، بہو تھی۔ اس بڑے گھر کے ہر کونے کی مالک تھی۔ چھوٹے بڑے تمام کام اور معاملات کی ذمہ دار تھی۔ اپنی ہی زندگی کے معاملے میں بے بس اور تنہا۔ بے سہارا اندھیروں سے برد آزما روشنی کی کرن کی متلاشی۔ اپنی فکروں کو بھلانے کے لیے خود کو مزید ذمہ داریوں میں جکڑ لیا۔ دوسروں کی خدمت، سب کے کام آنا، کسی کے دکھ درد کا مداوا کرنا میرا مقصد زندگی بن گیا۔ لیکن ذمہ داریوں کے بوجھ تلے، خود فراموشی کی کیفیت میں بھی کسی کی کمی کا احساس رہتا، ستاتا جو عثمان لے گیا تھا۔ وہ بے بات کی خبریں، وہ قہقہے سب کہیں کھو گئے۔ اس کا چہرہ چٹان کی طرح سخت ہو گیا تھا۔ اے اللہ میری زندگی اتنی طویل کیوں ہے۔ بے مقصد زندگی۔

پھر احساس ہوا لوگ مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔ سرگوشیاں کرتے ہیں۔ میری شادی کو تین سال ہو گئے تھے۔ لوگ مجھ سے کیا چاہتے تھے؟ پھر پتا چلا۔ چچی اماں کو پوتا کھلانے کا ارمان ہے۔ چچا جان بھی اب آرزو مند ہیں۔ میں نے کبھی یوں نہ سوچا تھا کہ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔ میں سمجھتی تھی زندگی ایسے ہی بسر ہو جائے گی۔ اس گھر کی پناہ میں چچا ابا کے تحفظ میں جو عثمان کے ساتھ زیادتی ہوئی اور جیسا بے رحمی کا سلوک وہ میرے ساتھ کرتا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہو گا۔ مگر نئی بات ہو چکی تھی۔ گھر خاندان کے سب ہی میری گود میں ہمکتا ہوا بچہ دیکھنا چاہتے تھے۔ سوالات، پریشانی، مشورے اور فکر کے اظہار کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کبھی چچی اماں کہتیں۔

”چلو بیٹی! تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔“

میں زبردستی خود کو کسی کام میں الجھا لیتی۔ یا اللہ کیا کروں۔ میں بیمار تو نہیں ہوں۔ تو ڈاکٹر کے پاس کیا کرنے جاؤں۔ کچھ دن اسی طرح میں نے ٹال دیے۔ مگر اتفاق سے چچی اماں کی جاننے والی ایک لیڈی ڈاکٹر ان سے ملنے آ گئیں۔ میرا ذکر ہونا تو ضروری تھا سو مجھے بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے جانے لگیں۔

”چلو میں تمہارا معاینہ کر لوں۔ آؤ ڈرو نہیں۔“

”مگر میں بیمار نہیں ہوں۔ ٹھیک ہوں۔“

”یہی تو دیکھنا ہے۔ بعض اوقات معمولی سی کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ مناسب علاج سے آرام آ جاتا ہے۔“

میں نے ان سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ انہوں نے پھر کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گی۔ صرف معاینہ کروں گی۔ دیکھو شروع میں ہی علاج کرا لینا اچھا ہوتا ہے۔ تم کمزور بھی ہو رہی ہو۔“

مجھے لگ رہا تھا کہ جسم سے خون خشک ہو گیا ہے۔ ہاتھ پیر کانپے اور حلق یک دم خشک۔ شاید میں واقعی کمزور ہو گئی ہوں۔ مجھے چکر آیا اور زمین پر گر گئی۔ اسی وقت صفیہ آپا بچوں کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ مجھے پکڑ کر بستر پر ڈالا گیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگایا۔ جانے کتنی دیر مجھے ہوش کا موقع نہ تھا۔ سب جمع ہو گئے تھے۔ کسے خبر تھی کہ یہ سلسلہ دراز ہو گا۔ کسی نے عثمان کو میری بے ہوشی کا بتا دیا۔ اس نے ضرورتاً مزاج پرسی کی، علاج کی تاکید بھی کی۔

”میں بیمار نہیں ہوں۔“ میں نے چپکے سے کہا۔ اصل بات میں اسے بھی نہ بتا سکی۔ کیا میں بزدل تھی؟

♥ ♡ ♡ ♥

فوزیہ کی شادی طے ہو گئی۔ مہمانوں کی آمد و رفت اور شور شرابا ہونے لگا۔ ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھتا گیا۔ جہیز کی تیاری، مہمانوں کی خاطر مدارات میں گھن چکر بن گئی۔ دن ختم ہوتا تو اگلے دن کے کاموں کی فکر نیند اڑا دیتی۔ شادی کا دن بھی آ گیا۔ مہمانوں کا ہجوم۔ ڈھول کے ساتھ بے سری آوازوں کا شور، نت نئی فرمائشیں۔ میں پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھی۔ برات آ گئی۔ میں سمدھیانے والوں کو مناسب جگہوں پر بٹھا رہی تھی کہ پیچھے سے کسی سے اپنا نام سن کر میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ چچی اماں کسی معمر تازی عورت سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ پھر اس معمر نے میری سمت بغور دیکھا اور کہا۔

”اچھا یہ ہے۔ بلانا ذرا۔“ چچی اماں نے مجھے پکارا۔ میں کچھ جھجکتی ہوئی ان کی طرف آئی۔ عورت کی نظریں برچھی کی انی کی طرح میرے جسم میں چبھ رہی تھیں۔

”کتنے دن ہوئے شادی کو؟ چار سال؟ نہیں؟“

چچی اماں گھبرا کر بولیں۔ ”کیا؟ نہیں؟“

”دیکھیے ہو سکتا ہے کہ شادی کو چار سال ہو جائیں اور لڑکی کی چال میں وہ مستی ہی نہ ہو۔ برا نہ ماننا بی بی! تمہاری بہو۔ اتنا الھڑپنا تو کنواریوں میں ہوتا ہے۔ میں تو چال دیکھ کر ہی بتا دیتی ہوں کتنے دن شادی کو ہوئے۔ کتنے دن کا پیٹ ہے۔ چار سال ہو گئے تو مجھے کوئی نشانی ہی نہیں ملی۔ یقین نہیں آتا۔ اتنے برس میں اولاد نہ بھی ہو پھر بھی چال تو بدلنی چاہیے۔ میرا تجربہ تو دو چار چالیس برس کا ہے۔“

چچی اماں کے پاس بیٹھی خواتین مجھے افسوس اور ترحم کی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ منٹوں میں ہر طرف مشہور ہو گیا۔ بہو بانجھ ہے۔ میں نے چاہا تھا زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ کتنی نظروں کا ہدف بن گئی

اور کتنی زبانوں کا موضوع۔ میں واپس آ رہی تھی تو ان
دادی اماں کی آواز میں نے سنی۔
"وہ ضعیف ہوا مجھے یقین نہیں۔ تم نے میری آزمائش
کے لیے تو اس بے چاری کو نہیں بلا لیا۔ یہ شادی شدہ
لگتی ہی نہیں۔"

میں کمرے میں بند ہو گئی۔ پھر تو رخصت ہو گئی
مہمان بھی چلے گئے۔ میں نکلی ہی نہیں۔ رات کو
عثمان بھی اندر نہیں آیا۔ وہ باہر مصروف تھا۔ یہ بھی
اچھا ہوا ورنہ میری دل خراش سسکیوں سے اس کی
نیند خراب ہوتی۔

♥ ♥ ♥

اگلے روز گھر کے لوگوں کی زبان پر میرا ہی ذکر تھا اور
سمجھانے کی وہ ماہر تجربہ کار دائی جو حیرت انگیز
صلاحیت کی ماہر تھی اور پیدا ہونے سے پہلے بچہ کی
جنس اور تاریخ پیدائش صحیح بتا دیتی تھی۔ اتنے
وثوق سے ایک انکشاف کرے اور لوگ یقین نہ
کریں۔ اس انکشاف کا جو نتیجہ نکلنا چاہیے تھا، وہ ہوا
چچی اماں مجھ سے بیزار ہو گئیں۔ سب سے منہ
چھپائے کم سامنا کرتی۔ گھر میں کسی نے کسی کی
خدمت یا محنت میں کمی نہیں کی۔ کسی کام میں کوتاہی
نہ کرتی مگر پھر بھی سب کو میرے ہر کام پر اعتراض
ہوتا۔ چچی اماں کی نظریں بدل گئی تھیں۔ پھر انہوں
نے چچا ابا کو بھی باخبر کر دیا۔ نجانے کن الفاظ میں اور
کیا کہا تھا مگر سننے میں یہی آیا کہ بچے کی زندگی کی بربادی
اور آنگن کا سونا پن برداشت نہ کر سکے۔
کیسی ان کی آرزو تھی۔ عثمان کا گھر اسی لیے جلدی
جلدی بسایا تھا کہ آنکھوں سے پوتا پوتی دیکھ لیں۔ مگر
کیا معلوم تھا ان تلوں میں تیل نہیں۔
چچا ابا سخت بیمار ہو گئے۔ سنا کہ دل کا دورہ پڑا ہے۔
میں بھی دل پکڑ کر رہ گئی۔ چچی اماں کے خیال میں ان کی
اس بیماری کی ذمہ دار بھی میں ہی تھی۔ میں انہیں
دیکھنے گئی۔ چچا ابا نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میرا
دل تڑپ گیا۔ ان کے پلنگ کی پٹی پر سر رکھ کر میں
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہاں میں آپ کو کچھ نہیں دوں گی۔ نہ زندہ کھلونا،
آنگن کو مہکانے والا پھول۔ میں خزاں کا پیڑ ہوں،
بہار سے ناآشنا، میں جائیداد بھی نہیں دے سکتی اور وہ
دے چکی ہوں۔ مجھ سے اس سے زیادہ کی توقع نہ
رکھیں چچا ابا! میں بے بس ہوں۔ مگر وہ نہیں ہوں جو
لوگ سمجھ رہے ہیں۔"
میں زبان سے کہنا چاہتی تھی مگر نہ کہہ سکی۔
آنسوؤں کی زبان اگر وہ سمجھتے ہوتے تو میں اتنے آنسو
بہاتی کہ چار سال کے صبح شام کا کرب دھل جاتا۔ چار
سال کی تاریک خاموش راتوں کا اندھیرا چھٹ جاتا۔
جلتی ہوئی دوپہروں کی تنہائی کی جلن [illegible] میرا
احساس اگر چچا ابا تک منتقل ہو جاتا تو بہ زبان خاموشی
میں ان دکھوں کی کہانی ضرور سناتی۔ جب بے نور
مستقبل، خوفناک سناٹے اور مہیب اندیشے میرے
ساتھ تھے۔ عثمان پر ہونے والے ظلم اور نتیجے
میں اس کی بے رحمی اور انتقام کاش وقت پلٹ جاتا۔
میں عثمان کے انتقام سے بچ جاتی۔ سرخرو ہو جاتی۔
[illegible]
کہ اس کا ذمہ دار مجھے تو نہ ٹھہراؤ۔
اگلی رات صبح ہونے سے پہلے چچا ابا رخصت ہو
گئے۔ آخر وقت میں ان کے پاس عثمان ہی تھا۔ دوسرا
دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔
نہیں جانتی ابا کو سب پتہ چل گیا تھا۔ "اگلے دن عثمان
نے مجھ سے کہا۔ "ان کی موت بھی تمہارے حساب
میں جمع ہو گئی۔" وہ بے رحمی سے بولا۔
میں دیکھتی رہ گئی۔ اتنا سنگ دل۔ اس نے کیا
بتایا ہو گا؟ میرے ساتھ کیے سلوک کی تفصیل، اپنے
انتقام کی کہانی یا شامہ سے شادی نہ ہونے پر ضد کا
شاخسانہ۔ چچا ابا برداشت نہ کر سکے۔ اپنی تلخیاں
اپنے نظریات اور اصول پسندی کو لے کر رخصت ہو
گئے۔ عثمان نے ان سے بھی انتقام لے لیا تھا۔ اب وہ
قدرے پرسکون ہو گیا تھا۔ گو کہ میری راتیں اسی طرح
اس کے کمرے کے کونے میں بسر ہو رہی تھیں اور بے

آواز آنسوؤں سے میرا تکیہ مستقل نم رہنے لگا۔ چچی
اماں مجھ سے بے زار تھیں۔ خوش بھی کون تھا میری
زندگی تو بے رس تشنہ اور بے رنگ تھی ہی۔ مگر میری
وجہ سے کوئی بھی مسرور نہ تھا۔ میں چچا ابا کی روح کو
شرمندگی سے بچانے کے لیے ہر گھڑی سسکتی رہی۔ مگر
جب چچی اماں نے صاف طور پر مجھے ہی گھر کی بربادی کا
ذمہ دار ٹھہرایا۔ مجھے ہی چچا ابا کا قاتل قرار دیا تو میں
تڑپ کر رہ گئی۔ اس رات عثمان کمرے میں آیا تو میں
اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔
"میں نے تم کو دکھ بہت دیے ہیں مگر تم سے کچھ
مانگا نہیں ہے۔ میں مانتی ہوں کہ میں ہی تمہاری زندگی
برباد کرنے کی ذمہ دار ہوں، بہت سی خرابیوں کی جڑ
ہوں مگر عثمان! پھر بھی انسان ہوں۔ جینے کا حق رکھتی
ہوں یا پھر مجھے اس کا بھی حق نہیں۔"
عثمان کے ہونٹوں پر طنز کا تبسم نمودار ہوا۔ "اوہو"
اس نے کہا۔ "بڑے بڑے انکشافات ہو رہے ہیں
آج۔ مگر کاش تم نے کبھی یہ سوچا ہوتا کہ میں بھی
جینا چاہتا ہوں۔ تم نے تو مجھ سے زندگی کی خواہش ہی
چھین لی ہے اور شکوہ بھی کر رہی ہو۔"
[illegible] آج میں تم سے کچھ مانگوں تو تم [illegible] پہلی
بار میں سوال کر رہی تھی، لجاجت سے کسی امید پر۔
"نہیں۔ میں تم کو کچھ نہیں دے سکتا۔ کوئی حق
کوئی بھیک نہیں۔ موت مانگو گی تو وہ بھی تم کو [illegible]
نہیں مل سکتی۔"
میرا دل بھر آیا۔ کیسا کڑوا لہجہ تھا۔ سخت اور چبھتی
ہوئی آواز۔
"میں جانتی تھی کہ تم یہی کہو گے۔ اچھا کچھ بولنے
کی، کہنے کی اجازت تو دو گے۔"
"اب تک جو بکواس تم نے کی ہے اس کی اجازت
لی تھی؟"
"غلطی ہو گئی۔" میں نے آواز کی رقت گلے میں
ہی چھپا لی۔ "میں تم سے اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں کہ ابھی
وقت گزرا نہیں۔ چچا ابا نہیں رہے اور چچی اماں کی
آرزو ہی پوری ہو جائے۔ تم شامہ سے شادی کر
لو۔ میں تحریری اجازت دے دوں گی۔"
میں نے جلدی سے بات پوری کی۔ عثمان کے
چہرے پر ناگوار تاثر ابھر رہا تھا۔ "مجھ پر یہ کرم اور
نوازش کس لیے کی جا رہی ہے؟"
"میں تمہاری دشمن نہیں ہوں عثمان! اگر
تمہارے ساتھ زبردستی ہوئی ہے تو میرے ساتھ بھی
جبر ہوا۔ تم نے بھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ میں یہ
نہیں چاہتی تھی مگر چچا ابا کے حکم [illegible]"
"بس تھک گئیں؟" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔
"نہیں۔ میں تم کو یوں عنایات کی اجازت دوں گا نہ ہی
تمہیں آزاد کروں گا۔ میں تم کو ترسا ترسا کر زندہ رہنے
پر مجبور کروں گا۔ یہی میرا ارادہ تھا، یہی ہے، یہی رہے
گا۔"
"میں نے تم سے آزادی کی بھیک تو نہیں مانگی۔ تم
جانتے ہو، اس گھر کے سوا میرا کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں
ہے بخدا۔ میں جس طرح گزر رہی گزار لوں گی۔
یہیں اس گھر کے کونے میں۔ تم پر کوئی بوجھ نہیں ہو
گا۔" پتا نہیں کس طرح برداشت کر رہی تھی میں۔
"ظاہر ہے ظاہر ہے۔" عثمان مضحکہ اڑانے کے
انداز میں بولا۔ "جائیداد والی جو ہو۔"
"یہ زمین، جائیداد، یہ دولت کے انبار، عثمان! چھوٹی
چھوٹی خوشیوں کے مقابلے میں ان کی حیثیت ہی کیا
ہے؟ مجھے بتاؤ۔ اس نے ہمیں کیا دیا ہے۔ حسرتیں،
دکھ، مصلحت میں ڈوبے فیصلوں کا کرب۔ نہیں مجھے
اس جائیداد سے کوئی غرض نہیں۔ میں یہ زمین کسی کو
دے دوں گی۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔"
"مجھے دوسری شادی کی اجازت دینے کے بعد
بھی؟"
"ہاں۔ اس نے مجھے دیا ہی کیا ہے جو مجھے قاتل بنا دیا
تمہاری خوشیوں کا۔ مجھے سازشی اور فریب کار بنا دیا
نہیں۔ اب میں اور الزام نہیں سہہ سکوں گی۔ مجھے
سرخرو ہونے کے لیے یہ قربانی دینی ہے۔"
عثمان کو کچھ سوچنا پڑا۔ میں نے اسے شادی کی
اجازت تحریر کے ذریعے دے دی۔ اپنی زمین بھی اس

کے نام کرنے کی درخواست لکھ دی۔ اپنی زمین بھی اس کے نام کرنے کی درخواست لکھ دی۔ مجھے یقین تھا۔ اگر میں جائداد کی مالک نہ ہوتی تو میرا سفر حیات بالکل جدا ہوتا۔ شاید عثمان کو بھی یقین آ گیا تھا۔ اس نے اگلے دن ہی چچی اماں کو بھیج دیا اور پھر ان کو لے کر شام کو گھر گیا۔ واپس آیا تو بے حد مطمئن تھا۔

"میں بہت خوش ہوں۔ میری آرزو پوری ہونے والی ہے۔"

"میں بھی یہی چاہتی تھی۔" میں نے کہا کہ "تمہارا انتقام پورا ہو۔" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"انتقامی جذبہ سرد ہو جائے تو انسان ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے نا۔" میں نے وضاحت کی۔

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ لیکن تم پھر کہاں رہو گی؟" عثمان کو بالآخر میرا خیال آ ہی گیا۔ شاید اس کا ذہن ہر بوجھ سے خالی تھا۔ کسی بھی انسان پر ہنستا ہے تو لوگ اس سے ناخوش ہو جاتے ہیں۔ ایک مکرا ہٹ ڈال ہی دیتے ہیں۔ میں ایسی قسمت لائی تھی کہ کوئی میرا ہمدرد نہ رہا۔ میری قربانی نے عثمان کو کچھ نرم کر دیا۔ وہ بار بار کہتا۔

"بہت بدقسمت ہو تم۔ کہیں سے بھی تم کو کوئی خوشی نہیں ملی۔"

"تم کہو تو میں تم کو لکھ کر دے دوں۔ میں تم پر جبر کرنا نہیں چاہتا۔ جہاں چاہو جیسے چاہو زندگی گزار لینا۔" آخر اس نے کہہ دیا۔ اس کا انتقامی جذبہ سرد ہو چکا تھا۔

ثمامہ کے والد نے میری علیحدگی کے بارے میں سوال اٹھایا تھا مگر چچی اماں نے کہہ دیا تھا۔ "وہ اپنے مرحوم شوہر کی روح کو اذیت نہیں پہنچا سکتیں۔ عثمان کی خوشی کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے مگر زیب اس گھر کی عزت ہے۔ وہ کہیں نہیں جائے گی۔"

"میں بھی چچا ابا کی روح سے شرمندہ ہونا نہیں چاہتی۔ یقین کرو میں کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔ چار سال کی رفاقت (نام کی) اور وابستگی (ظاہری) میرے لیے وہی کافی ہے۔ میں صرف تمہاری خوشی اور خانہ آبادی چاہتی ہوں۔"

وہ رات اگر مجھ پر بھاری گزری تو عثمان بھی پرسکون رہا۔ کروٹیں بدل بدل کر اس نے صبح کر دی۔ چند دن بعد ہی گھر میں زیور کپڑے کا چرچا ہونے لگا۔ عثمان کی بہنیں بھی آ گئیں۔ سب خوش تھے۔ میں سب کی نظروں سے بچ کر کمرے میں وقت گزار دیتی۔ قیامت کے لمحے بھی مجھ پر گزرے۔ [illegible] کون بھی ہے سنبھل۔ کیا میں بے حس تھی؟

میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھی۔ جس کیفیت سے گزری ہوں وہی ان الفاظ کے درد کو محسوس کر سکتا ہے۔ سننے اور دیکھنے والے سمجھ بھی نہیں سکتے کہ میں کس اذیت سے دوچار ہوں۔ یہ خبر بھی ضرور تھی کہ میری یہ قربانی کام آئی۔ عثمان کے قہقہے واپس آ گئے تھے۔ اس کی محبت کامیاب ہو گئی۔ چچا ابا کو جن باتوں اور رسموں سے اختلاف تھا۔ وہ سب ہو رہی تھیں۔ ثمامہ کے والد کی ہر شرط مانی گئی۔ ان کی مرضی کا حق مقرر ہوا۔ زمین کا ایک حصہ بھی تحریری طور پر ثمامہ کے نام کر دیا گیا۔

چچا ابا ایسی شادی سے اس لیے نفرت کرتے تھے۔ شرطوں سے نفرت کی وجہ تھی۔ لڑکیاں امانت ہوتی ہیں اور امانت کی واپسی غیر مشروط ہوتی ہے۔ خدا نے بیٹی کو رحمت کا درجہ دیا ہے اور اللہ کی رحمت کے لیے سودے بازی کرنا اس کی توہین کرنا ہے۔ چچا ابا نے اس زمانے میں کس طرح اپنے اصول قائم رکھے اور کیسے ان کی حفاظت کی۔

♥ ♡ ♡ ♥

شادی دو دن بعد تھی۔ میں نے عثمان کا کمرہ خود ہی چھوڑ دیا۔ اتنے بڑے گھر میں میرے لیے کہیں جگہ نہ تھی۔ عثمان کے کمرے کا وہ کونہ اور قالین جو چار برس تک میرا تھا اب میرا نہ تھا۔ اب مجھے خود ہی سب کچھ کرنا تھا۔ اپنی جگہ بنانی تھی۔ اس لیے اسٹور میں پلنگ سے اتار کر کونے میں ڈال دیے اور اپنا بستر کر کے اس میں لیٹ گئی تھی۔ شادی ہوئی۔ دلہن آئی، ہنگامہ رہا۔ اگلے دن صبح رضیہ آپا کے بچے جب معمول مجھ سے ناشتے کے طلب گار ہوئے۔ خواتین نیند کے مزے لے رہی تھیں۔ سوچا تھا میں کسی کام میں دخل نہ دوں گی۔ مگر بچوں کو بھوکا دیکھنے کے بعد یہ ممکن نہ تھا۔ جب دخل دے ہی دیا تو پھر فرصت کا لمحہ کہاں تھا۔

عثمان کی پہلی شادی تو چند لوگوں کی موجودگی میں افراتفری کے عالم میں ہوئی تھی مگر اب سب بہنوں اور ماں کو دل کے ارمان نکالنے کے موقعے ملے تھے۔ غضب کی مہمان داری تھی۔ نوکر بھی بوکھلا گئے تھے۔ دن بھر چائے ناشتے کی فرمائش ہوتی رہی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ عثمان خود چائے کا کہنے آیا۔ اس کے سرال والے آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ رک سا گیا۔

"پھر رہنے دو۔" کہہ کر پلٹ گیا۔ اس کے بعد جب بھی میرا اس کا سامنا ہوتا، وہ واپس چلا جاتا۔ باتیں کرتا ہوتا مجھ پر نظر ڈالتے ہی چپ ہو جاتا۔ مسکراہٹ چہرے سے غائب ہو جاتی۔

میں سوچتی۔ کیا میری ذات کی نحوست نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ لیکن کیا کرتی گھر میں بے شمار کام تھے۔ سب کو میری عادت پڑی ہوئی تھی۔ باورچی خانے کے کاموں کے علاوہ چچی اماں کو نہلوانا، کپڑے نکال کر دینا۔ بوا کے پھٹے کپڑے سینا، رضیہ آپا، صفیہ آپا کی خاطر داری، ان کے بچوں کی فرمائشوں کو پورا کرنا۔ سب بدستور میرے ذمے تھا۔ میں کب چھپا کرتی کہاں چھپتی۔ ایک روز رضیہ آپا نے کہا۔

"زیب! کچھ پوچھنا چاہتی ہوں بتاؤ گی؟"

میں منتظر نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ بولیں۔

"سچ سچ بتانا۔" وہ چپ ہو گئیں۔

"رضیہ آپا! بولیے نا؟"

"فوزیہ کی شادی میں دائی ماں نے جو کہا تھا اس کی حقیقت جاننا چاہتی ہوں میں۔"

میں نے پہلو بچا کر کہا۔ "چھوڑیے پرانی ہو گئی بات اب اس کا کیا ذکر۔"

"میں جاننا چاہتی ہوں۔ سچ بتاؤ کیا عثمان نے اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کا انتقام تم سے اس طرح لیا ہے کہ اور تم بے قصور ہو یعنی تمہاری تمہارے اندر کوئی کمی نہیں۔" وہ ہچکچا رہی تھیں۔

میں کھڑی ہو گئی۔ سینے کے اندر سانس رکنے لگا۔ "آپ۔ آپ کیسے؟"

"تم نے عثمان کو دوسری شادی کی اجازت اولاد نہ ہونے کی بنا پر دی تھی نا؟ حالانکہ سچ یہ ہے کہ وہ تمہیں سزا دے رہا تھا اور تمہیں ساری دنیا کے سامنے ذلیل کرنے کی اس نے سازش کی تھی۔ یہی بات ہے نا؟ اس نے وہ تحریر بھی زبردستی کسی دھمکی سے وصول کی ہو گی۔"

"نہیں نہیں رضیہ آپا! ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "آپ بے فکر رہیں میں تو زمین کا بوجھ ہوں۔"

"بکواس۔" وہ طیش میں آ گئیں۔ "اگر اشارہ بھی تم بتا دیتیں کہ قصہ کیا ہے تو میں عثمان کے منصوبے کو خاک میں ملا دیتی۔" رضیہ آپا رونے لگیں۔ "ہائے اس بدبخت اولاد نے میرے باپ کو اپنی خود غرضی کے عمل سے مار ڈالا۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی اور اب ثمامہ کو جانے کیا کچھ کہہ سنایا ہے۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ جب عثمان کو زیب سے نفرت تھی تو زبردستی کیوں کی گئی۔ بیچاری زیب پر ترس آتا ہے جب اسے کیسے الزامات لگے۔"

سبحان اللہ۔ اب ثمامہ کو مجھ سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ رضیہ آپا بہت خفا تھیں کہ میں نے عثمان کی بیزاری اور انتقام کا ذکر ان سے کیوں نہیں کیا۔ جب دائی ماں نے شبہ ظاہر کیا تھا تو جو لوگ بانجھ ہونے کا خطاب دے رہے تھے انہی کے سامنے کیوں نہیں تصدیق کی کہ ہاں سچ ہے۔ دائی ماں کا تجربہ سچا ہے مگر بات یہ تھی کہ میں انہیں کیسے بتاتی۔ خواہ عثمان یا اس کے گھر والے مجھے کتنا ہی ذلیل کر لیتے، میں اس کی بے عزتی گوارا نہیں کرتی۔ چچا ابا کے مجھ پر کتنے احسان تھے۔ میں انہیں کچھ نہ دے سکی تو ان کے بیٹے کی تذلیل کرنے کا مجھے حق نہ تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

ایک روز عثمان اسٹور میں آگیا۔ ادھر ادھر دیکھا، ہر سمت بکس، بستر اور الابلا سے بھرا ہوا کمرہ جس میں صرف ایک پلنگ کی جگہ تھی اور جس پر میرا بستر تھا۔

"تم میرا پیچھا چھوڑو گی کہ نہیں۔ اب تو چین لینے دو۔" وہ دبی زبان سے بات کر رہا تھا۔

"میں تمہارا کیا لے رہی ہوں؟"

"اور چھوڑا ہی کیا ہے تم نے۔" وہ درد بھرے لہجے میں بولا۔ "چار سال گونگے بہروں کی طرح اس کمرے میں گزار دیے۔ میرے ذہن پر بڑا بوجھ ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ بار بار اس کونے میں نظریں پہنچتی ہیں۔ خالی خالی جگہ منہ چڑاتی ہے۔ لگتا ہے کچھ کمی ہے۔ جیسے ابھی تم بستر لپیٹ کر کہیں گئی ہو، آجاؤ گی۔ میں انتظار کرتا رہ جاتا ہوں۔ شمامہ شک کرتی ہے۔"

میری پلکیں بھیگ گئیں۔ "جب میں وہاں تھی تو نظر ڈالنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ اب۔" "مگر میں نے تو اپنا سامان بھی نہیں چھوڑا۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔ وہاں کوئی نشانی ہوتی تو چار سال میں عادت تو ہو جاتی ہے نا۔ اکثر شمامہ سے" وہ "[illegible] میں نے تو ہر بات اسے سچ سچ بتا دی ہے۔ پھر بھی بد گمانی کرتی ہے۔ میرا ہی دماغ خراب ہے۔"

"میں نے تو اسی لیے باہر نکلنا کم کر دیا ہے کہ شمامہ کی مجھ پر نظر نہ پڑے۔ اب اور کیا کروں؟" میں نے پوچھا۔

"شاید میرا ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔" اس نے تنگ آکر کہا اور اسٹور سے باہر نکل گیا۔ شمامہ عثمان سے لڑنے لگی۔ وہ اسے طعنے دیتی تھی۔ جب بھی لڑائی شروع ہوتی، میرا ذکر کسی نہ کسی طرح درمیان میں آجاتا۔

"دل و دماغ پر تو زیب کا قبضہ ہے۔" شمامہ کہتی۔ "ہر وقت یہی ذکر، یہی فکر کہ زیب کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ ایسی ہمدردی تھی تو مجھ سے شادی کیوں کی۔"

عثمان بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتا۔ پھر چچی اماں ان کے درمیان صلح کرواتیں۔ عثمان کئی کئی دن کھویا کھویا رہتا۔ کبھی تو انسانی جبلت کے مطابق مجھے خوشی ہوتی اور کبھی افسوس، عثمان کو وہ خوشی اب بھی میسر نہ تھی۔ شاید اس لیے کہ میری ذات درمیان تھی اور شمامہ کو میرا وجود کھٹک رہا تھا۔

"مرے اسے دفع کیوں نہیں کر دیتے۔ جب بھی نام لیتی ہوں، غصہ آجاتا ہے۔ ایسی ہی محبت تھی تو کیوں ڈھونگ رچایا تھا۔ جب تک اس کی نحوست گھر میں رہے گی۔ خوشی اور اطمینان نصیب نہ ہوگا۔"

وہ کھلے عام میری مخالفت کرتی۔ میں سوچ میں گم ہو جاتی۔ کیا میں منحوس تھی؟ اب اکثر چچی اماں میرے پاس آکر بیٹھ جاتیں اور عثمان اور شمامہ کی شکایتیں کرتی رہتیں۔ وہ دونوں سے نالاں تھیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

پھر عثمان کا ٹرانسفر ہو گیا، وہ اور شمامہ چلے گئے۔ میں اکیلی ہو گئی۔ کبھی کبھی عثمان سے بات ہو ہی جاتی تھی۔ فوزیہ کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ چچی اماں اس کے بلاوے پر چلی گئیں۔ میں نے خانساماں کو چھٹی دے دی۔ ایک چھوکرا اوپر کے کام کے لیے تھا۔ اسے بھی میں نے نکال دیا۔ [illegible] تھا۔ میں اور بوا دو آدمی گھر میں تھے۔ سعدیہ کے امتحان ختم ہوئے تھے۔ وہ بھی ماموں کے پاس چلی گئی۔ کبھی کبھی رضیہ، صفیہ آپا آجاتیں۔ گھنٹہ دو گھنٹے بیٹھ کر چلی جاتیں۔ دن تو گزر جاتے، راتوں کو بڑے گھر کی تنہائی، سناٹا اور ویرانی خوف زدہ کرتی۔ بوا اب بہری ہو گئی تھیں۔ ان سے زور زور سے بات کرنی پڑتی۔

پھر فوزیہ کے ہاں لڑکا ہونے کی اطلاع آئی۔ رضیہ آپا، صفیہ آپا بھی اس کے ہاں چلی گئیں۔ کبھی کسی دن ان کے بچے آجاتے تو کچھ رونق ہو جاتی۔ اس دن صبح سے بوندا باندی کا سلسلہ تھا۔ شام کو بارش کے آثار ہو گئے۔ سردی بڑھ گئی۔ بوا نے گھر کے تمام دروازے کھڑکیاں بند کیے اور باورچی خانے میں جا بیٹھیں۔ میں مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی کہ بوا کے بولنے کی آواز آئی۔ سلام پھیر کر دیکھا، عثمان اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ جاءنماز لپیٹتے ہوئے گھبرا کر [illegible]

کے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔

"میری عبادتیں ہو رہی ہیں۔ کچھ ہمارے لیے بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیا کرو، شاید دعائیں ہی دو گی۔"

"میں بھی کسی کو بد دعا نہیں دیتی۔"

عثمان نے بتایا کہ ثمامہ اپنے بھائی کے پاس گئی ہوئی تھی۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر یہاں سے نکل آیا۔ اگر معلوم ہو جاتا کہ وہ یہاں نہیں ہیں تو کیوں آتا۔ بھلا ہو کھانا لے کر آ گئیں۔ کھانا کھاتے کھاتے بولا۔

"میں بہت پریشان رہتا ہوں۔ مجھے تمہاری اس اجاڑ ویران زندگی سے خوف آنے لگا ہے۔ ڈرتا ہوں، تمہاری آہ نہ لگ جائے مجھے۔ تم کوئی فیصلہ کر لو۔ کہو تو کوئی رو کر کے دکھا دوں گا، تمہاری مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"تم میری فکر چھوڑو۔" میں نے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ "میں نے وعدہ کیا ہے کہ تمہاری زندگی میں دخل نہیں دوں گی۔ اب تو تم یہاں سے اتنی دور [illegible] ہو۔ اب کیا فکر ہے۔"

"اب تو اور بھی دور جا کر احساس شدید ہو گیا ہے۔ جب بھی خیال آتا ہے۔ میں نے اپنی ضد اور انتقامی جذبے سے تمہیں کتنا دکھ دیا، کس قدر تکلیف پہنچائی ہے تو بے چین ہو جاتا ہوں۔ میری زندگی بے سکون ہے۔ تم اپنی راہ کا تعین کر لو، میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔ خدا کے لیے مجھ سے میرا سکون نہ چھینو۔"

"نہیں نہیں۔ تمہاری بے سکونی کی وجہ میں نہیں ہوں۔ یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ تم بھول جاؤ اس بات کو اور میری [illegible] نہیں کی ہے۔ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔"

"جھوٹ ہے۔" وہ قدرے جھجک کر بولا۔ "سکندر بھائی نے اب تک شادی نہیں کی وہ شاید ابھی تک تمہارے منتظر ہیں۔"

"چپ رہو۔" میں نے بگڑ کر کہا۔ "ہم جیسے لوگ بار بار فیصلے تبدیل نہیں کرتے۔"

میں صفیہ آپا کی بیٹی کے لیے گڑیا بنا رہی تھی۔ رات کو بھی اس کے کپڑے سیتی رہی۔ گڑیا کو سرخ جوڑا پہنا کر اب دوپٹے میں ستارے ٹانک رہی تھی۔ عثمان مسلسل سوچ میں گم [illegible] کبھی کبھی دزدیدہ نگاہیں مجھ پر بھی ڈال لیتا۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی۔ [illegible] اپنی کوٹھری میں چلی گئی تھیں۔ میں سوچ رہی تھی، یہ گرج چمک والی رات اگر میں تنہا ہوتی۔ رات بھر خوف سے روتی۔ خدا کتنا مہربان ہے کہ اس نے عثمان کو بھیج دیا۔ پھر اچانک ہی تقدیر مجھ پر مہربان ہو گئی۔ عثمان نے میری مانگ میں ستارے بھر دیے۔ میں رونے لگی۔ بادل کی گرج یا بجلی کی چمک کے ڈر سے نہیں۔ اس روشن تعبیر سے خوف زدہ تھی جو خواب کبھی میں نے [illegible] کہکشاں کی چکاچوند نے ہر سمت نور ہی نور پھیلا دیا۔ پلکیں جھپک جھپک کر اپنے مستقبل کے دریچے میں جھانکنے لگی۔ وہاں بھی نور ہی نور تھا۔ [illegible] رقص کر رہی تھیں۔ میرے وجود میں [illegible] بکھر گئیں، چوڑیاں چھوٹنے لگیں۔ میرا نامکمل وجود مکمل ہو گیا۔ تو یہ [illegible] آزاد تتلی کی [illegible] خوشیوں کے [illegible] میرا اختیار [illegible] میرے اجڑے دیار میں بہار کی نوید بن کر [illegible] قہقہے لگاتا ہوا۔ حجن بوا [illegible] آواز [illegible] اچانک ہی بدل گیا تھا۔

پھر عثمان نے [illegible] اگل دیا۔ ثمامہ جو اس کی ناتجربہ کاری کا انعام تھی، بے جا ضد کے نتیجے میں اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اس نے عثمان کی توقعات کو خاک میں ملا دیا۔ جلد باز، [illegible] ضدی۔ وہ دولت کی [illegible] میری زمین کو اپنے نام منتقل کرانا چاہتی تھی تاکہ اس کے [illegible] اور زمین کے توسط سے وہ اپنی قدر کروا سکے۔ گھر میں آئے دن کے جھگڑے ہونے لگے۔ وہ اب ثمامہ خفا ہو کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئی تھی۔ عثمان پچھتا رہا تھا۔ چچا ابا کو یاد کرنے لگا۔ انہی کی ضد میں اس نے یہ بازی کھیلی تھی۔ عثمان نے میرے دامن میں پناہ ڈھونڈی۔ میں اسے مایوس کیسے کر سکتی۔ یہ تو میری طویل ریاضت، صبر و ضبط کے انعام

کے طور پر صلے میں نصیب ہوا تھا۔ دن اڑنے لگے۔ عثمان نے دفتر سے چھٹی لے لی۔ ہم خوابوں کے جزیرے میں سوتے جاگتے رہے۔ اس نے گھر سے باہر نکلنے کی شاید قسم کھائی تھی۔ کئی بار میں نے کہا "جا کر رضیہ آپا، صفیہ آپا کی خبر لاؤ۔" مگر وہ کسی سے [illegible] اسے مجھ سے جدائی گوارا نہ تھی۔ مگر جانا تو تھا۔ ٹرانسفر کروا کر آنے کی امید دلا کر وہ واپس چلا گیا۔

اچانک مجھے تھکن کا احساس ہوا۔ لگا میں پھر تنہا رہ گئی۔ حجن بوا کمزور تو تھیں ہی، ان پر رات کو فالج کا حملہ ہوا۔ اتفاق سے رضیہ آپا اسی رات آ گئیں۔ دو دن سخت پریشانی میں گزرے۔ حجن بوا ہوش میں نہ آئیں۔ تیسرے دن رخصت ہو گئیں۔ رضیہ آپا کے شوہر پر کوئی مقدمہ قائم ہو گیا تھا، وہ بے حد پریشان تھیں۔ ادھر حجن بوا کے مرنے کے بعد میری تنہائی کی فکر۔ چچی اماں وہاں کیوں رہ گئی تھیں یہ بھی ایک معمہ تھا۔ ویسے انہیں تو رضیہ آپا پیاری تھیں۔ میں رضیہ آپا کی پریشانی میں انہیں خوش خبری بھی نہ سنا سکی، عثمان کا دل بدلنے کی۔ اس صلے کی جو ناامیدی میں میری [illegible] اور قربانیوں کے بعد نصیب ہوا تھا۔ [illegible] اگر سب پر ظاہر [illegible] چچی اماں [illegible] تو وہ رضیہ آپا کے ہاں چلی گئیں۔ ان کے شوہر کا معاملہ سنگین ہو گیا تھا۔ وہ غم سے بیمار ہو گئیں۔ چچی اماں انہی کے پاس ٹھہر گئیں۔ [illegible] میں پاگلوں کی طرح سوچتی رہتی۔ ثمامہ کا ردعمل کیا ہو گا۔ جب عثمان بتائے گا تو وہ کیا کہے گی؟ اس کی فطرت کا اندازہ تھا۔ افسوس ہوتا تھا۔ اسے [illegible] احساس نہیں۔ عثمان کو ہم دونوں مختلف فطرتوں کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ ثمامہ سے دور ہو رہا تھا۔ جو میرا وجود برداشت کرنے پر راضی نہ تھی۔ عثمان اسے میری وفا اور ایثار کی مثال دیتا تو جل جاتی۔

"صبر کی بات دوسری ہے۔ اسے تو توقع نہ تھی کہ تم کبھی اسے چاہو گے اسی لیے اس نے شادی کی اجازت دی کہ تم کو اس کی قدر ہو۔"

عثمان نے کہا۔ "اسے اب بھی تو کوئی محبت حاصل نہیں ہوئی مگر وہ رسم وفا نبھا رہی ہے۔"

ثمامہ نے کہا۔ "اپنی اس قربانی کے بدلے میں وہ تمہاری محبت حاصل کرنے کی امید تو رکھتی ہی ہو گی۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اس سے علیحدگی حاصل کر لو ورنہ مجھے چھوڑ دو۔"

ثمامہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس کی خوشبو اڑ گئی تھی تب ہی عثمان میرے دامن میں پناہ لینے آ گیا تھا۔ وہ جو چچا ابا سے ٹکرانے کا حوصلہ کر بیٹھا تھا، انہیں یاد کر کے روتا تھا۔ اس نے ثمامہ کو کتنی کوششوں کے بعد پایا تھا۔ ثمامہ کو اس کی قدر نہ تھی وہ ہر جگہ ہر مقام پر عثمان کو اپنے سامنے جھکانا چاہتی تھی۔ اب یہ کوشش ناکام ہو جاتی۔ میرے معاملے میں عثمان اس کی کوئی بات ماننے پر تیار نہ تھا۔ اسے اپنے باپ کی اس آخری خواہش کا احترام ملحوظ تھا۔ وہ باپ کی روح کو تکلیف دینے کے خیال سے ہی کانپ جاتا۔ اسی لیے بار بار مجھ سے التجا کرتا کہ میں چاہوں تو وہ مجھے آزاد کر دے گا تاکہ باپ کے سامنے شرمسار نہ ہو۔ عثمان نے مجھے تسلیم کر لیا تھا۔ میں نے اسے تسخیر کر لیا۔ عثمان جیسے ضدی کو میں نے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ قوت برداشت، مضبوطی کردار اور بے نفسی سے میں نے اسے جیتا تھا، وہ اقرار پر مجبور ہو گیا۔

"تم ابا کی تربیت کا صحیح نمونہ ہو۔ ہم تو بگڑے ہوئے ہیں۔ تم میں یہ مضبوطی، استقلال پتا نہیں کیسے قائم رہا۔"

میں نے محسوس کیا تھا وہ چچا ابا کی تمنا کو برقرار رکھنا چاہتا ہے ورنہ گھر کو پرسکون رکھنے کے لیے وہ میری اجازت کے بغیر بھی کوئی قدم اٹھا سکتا تھا۔ تو میں کب اپنے چچا ابا، اپنے محسن کی آرزو سے انحراف چاہتی تھی اور جسے بے مانگے بھیک ملے تو کون بدنصیب ہو گا جو دامن سمیٹ لے۔ مجھے زندگی بھر کے لیے اتنا مل گیا کہ اور کسی انعام کی تمنا نہ رہی۔ عثمان کا پچھتاوا ہی میرا انعام تھا۔ رضیہ آپا کی پریشانی میں سارا گھر پریشان رہا تھا کس کو فرصت تھی کہ میری رام کہانی سنتا۔

سعدیہ سے معلوم ہوا کہ عثمان شامہ کو منانے گیا ہے۔ اسے لے کر یہاں آئے گا۔ چچی اماں شامہ سے ناراض تھیں جس نے عثمان کو منگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ انہیں اب میری قدر ہوئی تھی رضیہ آپا اب معمول پر آگئی تھیں شاید معاملہ اب دب گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس دن مجھے چکر آگیا۔ سنبھلنے کی کوشش کی مگر نہ سنبھل سکی، دھڑام سے گری۔ نیچے برتنوں کی ٹرے رکھی تھی۔ برتن چکنا چور ہو گئے مگر میری کمر بھی زخمی ہو گئی۔ اس دن بھی اتفاق سے وہی لیڈی ڈاکٹر موجود تھیں جو کچھ دن پہلے میرا معاینہ کرنا چاہتی تھیں۔ کمرے میں لے جا کر انہوں نے میری کمر پر دوا لگائی۔ بازو پر لگا رہی تھیں کہ میرا جی الٹ پلٹ ہونے لگا۔ ان سے ہاتھ چھڑا کر میں غسل خانے کی طرف بھاگی الٹی آ گئی تھی کچھ سکون تو ہوا مگر کمزوری بھی ہو گئی۔ اب بھلا ڈاکٹر صاحبہ مجھے کہاں چھوڑنے والی تھیں ہنستی ہوئی باہر آئیں چچی اماں سے کہا۔

"بہن! مبارک ہو۔ آپ دادی بننے والی ہیں۔ مٹھائی منگوائیے۔"

چچی اماں کے ہاتھ سے پان کی تھالی نیچے زمین پر جا گری آنکھیں پھاڑے وہ مجھے گھورتی رہیں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد انہوں نے مجھے ٹٹولنا اور سوالات شروع کر دیے پھر رضیہ آپا آگئیں وہ مجھے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

"تو اب اس گھر میں یہ بھی ہونے لگا۔" چچی اماں نے کہا۔ "جس عزت کی خاطر چچا نے عمر گزار دی اس عزت کا جنازہ بھتیجی کے ہاتھوں نکل گیا۔"

میں سن ہو گئی، جانے وہ کیا سمجھ رہی تھیں۔ کیا میں بدچلن تھی؟

"آپ اسے تنہا چھوڑ کر کیوں گئی تھیں۔" رضیہ آپا نے چچی اماں سے کہا۔

"میں تو خانساماں اور بوا کو چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ چھوکرا بھی تھا۔"

"مگر انہوں نے پہلے سے کوئی منصوبہ بنا رکھا ہو گا تب ہی خانساماں کو چھٹی دے دی۔ جانے اس چھوکرے سے ہی الٹ سٹ ہو گئی۔"

غصہ، ندامت اور شرم سے میں پانی پانی ہو گئی۔

"کہا کہ وہ دو آدمیوں کے لیے خانساماں کی کیا ضرورت تھی۔" چچی اماں میری نقل کر کے بولیں "مجھ کمبخت کو کیا خبر تھی کہ میرے پیچھے یہ گل کھلیں گے۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہی۔"

"آپ، آپ کیا سمجھ رہی ہیں چچی اماں! آپ مجھے اتنا ذلیل تو نہ کریں۔" غصہ میں میری آواز کچھ بلند ہو گئی۔

"لو اور سنو چوری اور سینہ زوری۔" چچی اماں سانپ کی طرح پھنکاریں۔

"اپنے بیٹے سے تو پوچھ لیجیے کون چور ہے اور کون سینہ زور۔" میں نے شرم و حیا بالائے طاق رکھ دی۔

"خبردار۔" وہ چنگھاڑیں۔ "اس کا نام نہ لینا۔ اب اس کی آڑ میں پارسائی کی چادر نہ اوڑھنا۔ سارا جہان جانتا ہے، وہ تمہیں منہ لگانا پسند نہیں کرتا۔"

"رضیہ آپا! خدا کے واسطے آپ تو یقین کریں۔"

"میں عثمان کے سوا ہر کسی پر یقین کر سکتی ہوں۔ اس کی غیر موجودگی۔"

"وہ وہ آئے تھے رضیہ آپا جی۔" میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہ تھا۔ اسے کسی نے دیکھا ہی نہ تھا۔ حجن بوا واحد گواہ مر چکی تھیں۔ اپنے دامن پر گندگی، کردار پر بدگمانی۔ خدا جانے میں نے کس طرح برداشت کیا نہ اپنا سر دیواروں سے ٹکرایا نہ آنسو بہائے، مجھ میں صبر و تحمل کی جو بے انداز طاقت تھی۔ اس نے لوہے سے زیادہ مضبوط اعصاب بھی دیے تھے لیکن یہ غلاظت بہتان، میری پاکیزگی پر، میری حیا پر انگشت نمائی۔ کیسے برداشت کیا تھا میں نے۔

میں نے طے کر لیا کہ جس گھر نے اب تک میرا بار اٹھایا ہے اب مزید بوجھ ڈالنا گوارا نہیں۔ شاید گھر والے مجھ سے اکتا گئے ہیں اسی لیے وقفہ وقفہ سے

مجھے اذیت پہنچائی جاتی۔ اب تو حد ہو گئی۔ شیشے میں بال آ جائے تو وہ بدنما ہو جاتا ہے۔ صاف شفاف کپڑے پر کیچڑ کی ایک چھینٹ بھی نمایاں ہوتی ہے۔ میں جانتی ہوں بے گناہ اور بے خطا ہوں۔ جب بھی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ وہ پچھتائیں گے مگر میں کیا پھر سے اس آن بان سے رہ سکوں گی۔ جس کا اعتماد ریزہ ریزہ کر دیا جائے اور یقین پاش پاش ہو جائے۔ اس کی زندگی میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔

عزت، غیرت، عصمت، حمیت، حیا، شرم، خودداری اور انا اس سرے سے اس سرے تک میرے غرور کی دیواریں چکنا چور ہو رہی تھیں۔ انسانیت اور افتخار کی شی، انسانیت اور افتخار کے تمام قلعے منہدم ہو گئے۔ جذبات کے باوجود غصہ، بے بسی اور نفرت کے بھنور میں گھر گئی۔ چکراتی رہی۔ ہوش کھو بیٹھی۔ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ نحیف جان نے مجھے بچا لیا۔ ورنہ عزت بچھ دور نہ تھی۔ احساس ذلت نے مجھ سے میرا وقار بھی چھین لیا۔ تب میں نے ٹیلی گرام سے عثمان کو بلایا۔ چچی اماں کو پھر بھی یقین نہ تھا۔

”خیر آنے دو عثمان کو بھی۔ جس کو دودھ پلا کر پالا ہے ایک ناگن تو ناگن ہوتی ہے۔ ڈس لیتی ہے اپنے دودھ پلانے والوں کو۔ عثمان سے بدلہ لینے کا یہ طریقہ بھی خوب تھا۔ خود عزت کی دشمن بن گئی۔ لے لیا بدلہ۔ کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔“

کچھ کہے جاؤں میں گونگی بہری بن گئی مگر اندھی نہ ہوئی۔ ان آنکھوں نے کیا کچھ دیکھنا تھا۔ میں ایسی قسمت لائی تھی کہ جس کے نشیمن کو بہار راس نہیں آئی۔ میں عثمان کی منتظر تھی۔ وہ ہنستا ہوا آئے گا اور میرے دامن پر لگے داغ دھو ڈالے گا۔ ایک لفظ صرف ایک لفظ۔ وہ آیا بھی تو خون میں نہایا ہوا۔ راستے میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور اسے اس قابل ہی نہ چھوڑا کہ وہ بول سکتا۔ اس دن میں نے اپنی آنکھ سے قیامت دیکھی۔ محسوس کی۔ گزرتی ہوئی قیامت دل و دماغ پر۔ محسوسات پر، جسم پر کہاں نہ تھی وہ قیامت۔ سارا صبر رخصت ہو گیا۔ چیخوں کو نہ روک سکی۔ رضیہ آپا نے روتے روتے مجھ سے کہا۔

”ایکٹنگ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

عثمان ہسپتال میں تھا۔ میں گھر میں۔ سب مجھے ہی اصل جادوگر کا، اس نحوست کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ میں سبز قدم بتائی جا رہی تھی۔ جس نے پہلے ماں باپ کو کھایا، پھر چچا ابا کو اور اب۔

میں جادو گرنی نہ تھی۔ مگر کئی لوگ گواہی دے رہے تھے کہ انہوں نے مجھے کچھ کرتے دیکھا ہے۔ میں اپنی کامیابی کے لیے کوئی عمل، نہیں کیا مگر لوگ کہتے تھے میں عمل کرتی تھی۔ میں نے کبھی عثمان اور ثمامہ کی بدخواہی نہ کی مگر سب کا خیال تھا۔ ان کے درمیان نکاح کا سبب میرے ہی ہے، مجھ سے بڑھ کر تھے۔ عثمان کی حالت مخدوش تھی۔ وہ میرے بارے میں ایک لفظ کہتا تو بچا لیتا۔ کچھ بھی بول سکتا تھا وہ بیہوش تھا جب بھی اسے ہوش آتا ڈاکٹر اسے نیند کا انجکشن دے کر سلا دیتے۔

اسے دیکھنے، ملنے اور بولنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ میں اس کا حال سنتی اور بے دم ہو کر بیٹھ جاتی۔ مجھ پر [illegible] مجھے کہتا کہ اس کی [illegible] سایہ نہ ڈال دوں۔ گھر والے کی رو میں تھا۔ اس کی صحت و سلامتی کی دعائیں کی جا رہی تھیں۔ چچی اماں کی بے قراری، بہنوں کی آہ و زاری۔ میں خاموش تماشائی تھی۔ میرے دل میں ہر دم دھواں سا بھرا رہتا۔

♥ ♡ ♡ ♥

پھر ثمامہ بھی آ گئی۔ اس نے آتے ہی دل کے پھپھولے پھوڑنے اور مجھے مارنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔ زیادہ صدمے میں یہ بھی ہوتا ہے۔ جب انسان اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار کسی دوسرے کو ٹھہراتا ہے۔ میں ثمامہ کا دکھ سمجھ سکتی تھی۔ اس کے دل پر بھی تو وہی قیامت گزر رہی تھی جس نے میری دنیا زیر و زبر کر دی تھی۔ مگر اسے میری حالت کا احساس نہ تھا۔ میں بھی عورت تھی، بیوی تھی۔ میرا سہاگ خطرے میں تھا۔ جس آگ میں وہ جل رہی تھی وہ آگ مجھے بھی جلا کر

پھونک رہی تھی۔ جو طوفان اس کے نشیمن پر حملہ آور تھا اس نشیمن میں میرا بھی کچھ حصہ تھا۔ جب ہمارے دکھ مشترک تھے ہماری خیریت عثمان کی خیریت پر منحصر تھی۔ تو ثمامہ صرف مجھے ہی اپنی بربادی کا ذمہ دار کیوں ٹھہرا رہی تھی۔ ثمامہ کی آمد سے ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کوئی نہ بولے۔ سب خاموش رہیں۔ میرا رواں رواں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے آگے سر بسجود رہتا۔ اے اللہ میری شرم رکھ لے۔

رات کو عثمان کی حالت کچھ اور بگڑ گئی۔ چچی اماں ہسپتال سے آئیں تو ان کی حالت ابتر تھی۔ رو رو کر بے حال تھیں۔ ناامیدی میں انسان دیواروں سے سر پھوڑتا ہے لیکن اس سے کچھ ہوتا نہیں، خود ہی زخم کھاتا ہے۔ اسی لیے میں بے تاب ہو کر چچی اماں کی جانب بڑھی اور انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

”خدا کے لیے چچی اماں! آپ مایوس نہ ہوں۔ خود کو اذیت نہ دیں۔ دعا کریں۔ خدا ضرور سنے گا۔ ماں کی دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔“

چچی اماں آپے سے باہر ہو گئیں۔ گالیاں، کوسنے انہوں نے مجھے [illegible] نہیں میری وجہ سے اذیت پہنچا رہی تھیں۔ [illegible] دشمن تھی۔ میری بددعاؤں نے ہی یہ دن دکھایا تھا۔ ان کے خیال میں تو میں نے ان کے بیٹے کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ میرے بلانے پر ہی تو وہ آیا تھا۔ میری بے گناہی ثابت کرنے۔ مگر ہوا کیا؟ سب کو ہی ثمامہ سے ہمدردی تھی۔ چچی اماں ماں تھیں۔ ثمامہ بیوی اور میں، میں کون تھی؟ میں پہلے ہی طے کر چکی تھی۔ عثمان کے آتے ہی اس گھر کو خیرباد کہہ دوں گی۔ اپنی بے گناہی کے ثبوت کے بعد کس قیمت پر رکوں گی۔ مجھے کسی کا بھروسا نہ تھا۔ کب لوگ گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیں اور اتنے بڑے بہتان کے بعد تو میرا وہاں رہنا ایک گالی سے کم نہ تھا۔ عثمان آ گیا تھا۔ مجھے مزید ذلیل اور رسوا کرنے۔ انہیں عثمان کے صحت یاب ہونے اور میری برأت کے لیے کچھ بولنے کا بھی انتظار گوارا نہ ہوا۔ سب مجھے اپنی نظروں سے اس گھر

سے دور پھینک دینا چاہتے تھے جب ایک بار پھر لوگوں کے سامنے چچی اماں نے میرے گل کھلانے کا انکشاف کیا تو میں سکتے میں آ گئی۔ میرا بے داغ دامن اور مضبوط کردار کسی گندگی میں ملوث ہو؟ کیا میں اسے برداشت کر سکتی تھی؟ اب تک تو گھر والے ہی لعنت ملامت کر رہے تھے اب دوسرے لوگ انگشت نمائی کریں گے کیسے نظر انداز کرتی؟ کیا میں بے غیرت تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

میں گھر سے نکلی تو شاید سب کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ جوش غضب میں گھر کی دہلیز پار کر کے باہر نکل آئی نہ کوئی ٹھکانا تھا نہ منزل۔ شہر کے گلی بازار بھی مجھ پر انگشت نمائی کرتے محسوس ہوئے۔ جیسے واقعی میرے دامن پر کالک لگی ہو۔ ٹرین مجھے دور لے جا رہی تھی۔ اس شہر سے اس شہر کے بے وفا لوگوں سے دور۔ جہاں تک ٹرین پہنچے گی میں بھی جاؤں گی۔ شاید وہی میری منزل ٹھہرے مگر ٹکٹ چیکر کو میری مجبوریوں کا کیا احساس ہوتا۔ اسے اپنے فرض کا زیادہ خیال تھا۔ جب ایک نیک دل خاتون نے میرا ٹکٹ بنوا دیا۔ غیر کا احسان، شاید وہ خضر راہ تھیں معذور تھیں اور اپنی بیٹی کے ہمراہ جا رہی تھیں۔

اسی وقت میری منزل کا تعین ہو گیا۔ زبان سے کچھ کہے بغیر ہی وہ میری مجبوریوں کو جان گئیں۔ میں نے ان نیک بی بی کی رفاقت قبول کر لی۔ بیٹی اپنے گھر رہتی تھی۔ کبھی کبھی ماں کو اپنے پاس لے جاتی تھی۔ اب انہیں چھوڑنے جا رہی تھی۔ میری وجہ سے وہ بہت مطمئن ہو گئی۔ ان دونوں اعلیٰ ظرف خواتین نے مجھ پر ایک بار بھی شک نہ کیا۔ کوئی سوال نہ کیا۔ مگر گھر پہنچ کر سب کچھ انہیں بتا کر مجھے سکون سا ہوا۔ مگر اس کے باوجود عثمان کا نام اور مقام نہ بتا سکی۔ اس گھر میں مجھے پورا تحفظ ملا بڑی بی میری ماں بن گئی تھیں۔ اس معاملے میں خوش قسمت ثابت ہوئی۔ میری اپنی ماں بھی پاکباز نیک سیرت صلح تھیں اور عبادت گزار تھیں اور منہ بولی ماں میں بھی نیکی کی تمام صفات موجود

تھیں۔ چچا ابا میری امی کی پاک طینتی کو اکثر خراج ادا کرتے۔

"ماں کی نیک آغوش اولاد کے لیے کسی بڑی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ ماں کی تقدیس، باپ کی سچائی مل کر اولاد کو خوب سے خوب تر بناتی ہے۔ زیب نے اپنی ماں اور باپ کی تمام خوبیاں لی ہیں۔"

چچا ابا کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ میں کمزور ہوتی تو جانے کن ہاتھوں میں پہنچتی۔ میرے والدین کی دعائیں ہی کام آئی تھیں۔ ان کی نیکیوں کا صلہ تھا کہ میں محفوظ مقام پر آگئی تھی۔ اماں بی نے بھی اس طرح میری حفاظت اور نگہداشت کی۔ جیسے میں نے ان کی کوکھ سے جنم لیا ہو۔ صرف عثمان کی خیریت سے بے خبری مجھے بے چین رکھتی۔ پھر میری گود ایک پھول سے مہکنے لگی۔ یہ پھول جو کنول سے زیادہ معصوم گلاب سے زیادہ شگفتہ تھا۔ عثمان نے مجھے بہت سے تحفے دیے تھے نفرت، انتقام، رسوائی لیکن یہ تحفہ بڑا ہی مقدس اور اچھوتا تھا۔ اس کی آمد نے میرے سارے دکھ دھو ڈالے۔ اب مجھے کسی کی پروا نہ تھی، کوئی مجھے کیا سمجھتا۔

عثمان کے گھر والے اب مجھ سے اتنی دور تھے کہ مجھے ان کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ میری خبر ان کو نہیں مل سکتی تھی۔ یہاں میں تھی اور میرا گل۔ گل کے تبسم نے مجھے نئی زندگی کی بہار سے آشنا کیا تھا اور جس کی قلقاریاں موسیقی حیات کی طرح میرے کانوں میں رس انڈیلا کرتی تھیں۔ اماں بی گل کو کھلونا کہتیں۔ سنسان گھر میں اس کے وجود نے رونق اور رنگینیاں بکھرا دی تھیں۔ میں اتنی مطمئن تو کبھی نہ تھی۔ ممتا کے نور سے میری آنکھیں دمکتی تھیں۔ اتنی روشنی۔ ایسا چراغ تو میں نے کبھی دیکھا نہ تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اماں بی کا بیٹا طویل مدت کے بعد انگلینڈ سے آگیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے عثمان یاد آگیا۔ وہی حرکتیں، ویسی ہی بے تکلفانہ باتیں اور خلوص کا اتنا ہی اظہار جیسے میں اس کی سگی بہن ہوں۔ وہ گل سے بھی جلد مانوس ہو گیا اور گل تو اسے چھوڑتا ہی نہ تھا۔ یہ کیسے رشتے تھے۔ جہاں محبت اور اخلاص تھا اور اپنائیت تھی۔ یہ دنیا اس دنیا سے کس قدر مختلف تھی جہاں سے میں آگئی تھی۔ ایک روز عجب اتفاق ہوا۔ میں درزی کی دکان سے نکل کر باہر آئی تو سڑک پر سکندر سے ٹکراؤ ہو گیا۔ ہم دونوں ہی دم بخود ہو کر رہ گئے۔ پھر سکندر نے ہی کہا۔

"تم؟ یہاں؟" گل کو دیکھ کر چونک گئے اور بولے۔

"بالکل ہو بہو عثمان ہے۔ بال، آنکھیں، چہرہ سب کچھ۔ میں تو جانتا تھا زیب! مجھے تمہاری ذات کا، تمہاری عظمت کا یقین تھا۔ تم اچھی تو ہو۔"

میں سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔ پہلے دل میں آیا، عثمان کی خیریت پوچھوں لیکن عقل نے مخالفت کی۔ اگر کوئی بری خبر..... نہیں۔ مجھے اس یقین پر ہی زندہ رہنا ہے کہ عثمان زندہ، صحت مند سلامت ہے۔ میں انہیں دھکا دے کر آگے بڑھ گئی اور سڑک پر بھاگتی چلی گئی۔ وہ میرے پیچھے نہیں آئے۔ انہوں نے پکارا بھی نہیں لیکن ان کی نظروں کی چبھن دیر تک میری پیٹھ جلاتی رہی۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر سکندر نے میرا صبر و قرار کیوں چھین لیا تھا۔ سکندر آپ یہاں کیوں آگئے۔ آپ نے مجھے اتنا بے چین کیوں کر دیا ہے۔ عثمان نے مجھے دیا ہی کیا ہے۔ دکھ ہی دکھ۔ اب میں مزید دکھی ہونا نہیں چاہتی۔ میری جھلاہٹ اور کھوئی کھوئی کیفیت دیکھ کر اماں بی نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں اماں بی سے کیسے چھپاتی۔ سکندر سے سامنا ہونے کا قصہ سنا دیا۔

وہ خفا ہونے لگیں۔ "بیٹی! تم نے غلطی کی جو اپنے شوہر کا حال دریافت نہیں کیا۔ تمہیں تسلی تو ہو جاتی۔ یاد رکھو، عورت کا سکھ شوہر کے وجود سے قائم رہتا ہے۔ تم دور ہو تو کیا ہوا، رشتہ ختم تو نہیں ہوا۔ تم اسے لاکھ بھلانا چاہو گی مگر بچے کا وجود ہر وقت یاد دلائے گا اور بچے کو باپ کی پناہ اور حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے تم سے کبھی پوچھا نہیں لیکن اتنا سمجھتی ہوں کہ وقت ابھی گزرا نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ

تمہاری کوتاہی قدرتی تعلق کے درمیان میں بڑی غلطی بن جائے اور تمہاری قربانیاں رائیگاں جائیں۔ تعلق بیٹے کے سامنے ماں کا بھرم نہ جاتا رہے۔ یہ رنگ لائے گا اور پھر باپ بیٹا تم کو ہی مجرم گردانیں گے۔ اگر وہ زندہ ہے تو یقیناً تم کو یاد کرتا ہوگا، تلاش کرتا ہوگا۔ صحت یابی کے بعد اس نے تمہاری صفائی دی ہوگی۔ اب اپنی زیادتی پر پشیمان ہوں گے، بیٹی! عظمت درگزر اور معاف کر دینے میں ہی فلاح ہے۔ مذہب نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔ دوسروں کی غلطی کو انا کا سوال نہ بناؤ۔ تم اب ماں ہو اور تمہیں ماں کی کمزوری کا علم ہو گیا ہوگا۔ وہ ماں قابل معافی ہے جس کا جگر گوشہ خاک و خون میں غلطاں اس کے سامنے آئے اور جس کی زندگی کی امید نہ ہو۔ ماں جو تخلیق کے کرب سے گزرتی ہے وہ معجزہ کی قوت بھی رکھتی ہے۔ اپنی ماں کا خون بھی کر سکتی ہے۔ ماں کی قوت کے بے شمار کرشمے ظاہر ہوتے ہیں۔ بیٹی! ماں بن کر سوچو اور دوسری ماں کو معاف کر دو اور ان کی امانت کی انہیں خبر دے دو۔ تمہارے ہر دکھ کی تلافی ہو جائے گی۔ چند! فیصلے تبدیل بھی ہو سکتے ہیں۔ اعلیٰ مقصد کی خاطر جذبات کا رخ موڑا جا سکتا ہے۔ یہ خدائی احکامات تو ہیں نہیں۔ ان کی غلطیوں کے ساتھ ساتھ اپنے عمل پر بھی انصاف کی نظر ڈالو۔"

میں پشیمان سی ہو گئی۔ سکندر سے کیوں بات نہیں کی۔ اگر نہیں کی تھی تو اماں بی کو بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے دل پر بوجھ آ گرا۔ شاید سکندر نے وہاں میری یہاں موجودگی کی بھی اطلاع دے دی ہو۔ مگر وہ مجھے کہاں تلاش کریں گے؟ کئی دن مضطرب رہی پھر قرار آ ہی گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اماں بی کو خالد کی شادی کی فکر تھی۔ ایک ہی تو بیٹا تھا اور ان کا حال یہ تھا کہ انگلینڈ سے آنے کے بعد مستقل ادھر سے ادھر گھومتے پھر رہے تھے۔ کبھی کسی کے ہاں تو کبھی دوسرے عزیزوں کے پاس۔ تو کبھی دوستوں سے ملنے جاتے، ان کی سیر و تفریح کچھ کم ہوئی تو میں نے اماں بی کی ترجمانی کا حق ادا کرنے کے لیے ان کی شادی اور انہیں سنجیدہ ہو کر ذمہ داریاں اٹھانے پر تیار ہونے کی تلقین کی۔ چپ چاپ سنتے رہے، مسکراتے رہے پھر بولے۔

"جناب! آپ حکم دیں اور ہم ٹال دیں؟ یہ مجال نہیں بس ذرا انتظار کریں۔ دراصل اس بار جو میں آیا کی طرف گیا تھا تو ان کے ہاں۔"

"میں سمجھ گئی۔ کوئی لڑکی نظر آ گئی ہوگی۔"

"بالکل سچ کہا آپ نے۔"

"تو اب انتظار کس بات کا ہے؟"

"دراصل پتا لگایا تو معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا بھائی تو میرا کلاس فیلو تھا اور اتفاق سے میری اس کی کچھ چھوٹی سی بات پر ٹھن گئی تھی۔ تمام کالج اس بات سے واقف ہو گیا۔ ہماری تعلیم ختم ہو گئی۔ مگر اس لڑکے سے دوستی نہ ہو سکی حالانکہ میں چاہتا تھا کالج کو خیرباد کہنے سے پہلے دوستی کر لوں مگر ایک جھجک تھی۔ انا کا سوال۔ وقار کا مسئلہ کہ میں پہلے کیوں جھکوں۔ بس اب میں نے اسے تحریری معافی نامہ بھیجا ہے اور تجدید ملاقات کے لیے بلایا ہے۔ جب خدا نے چاہا اور اس کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا۔ وہ آ جائے تو میں مدعا دراز کروں گا۔"

خالد نے وضاحت کی تھی۔ میں قائل ہو گئی اور اماں بی کو بھی اطمینان دلا دیا۔ سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ شام سے ہی بارش ہو رہی تھی۔ گیلی اماں بی کے کمرے میں گل کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ خالد کہیں گئے ہوئے تھے۔ جو نہی آہٹ سنائی دی میں سمجھ گئی خالد آ گئے ہیں۔ پھر دروازہ ذرا سا کھلا۔ خالد نے اندر جھانک کر کہا۔

"چائے مل سکتی ہے؟"

"ضرور۔" میں نے کہا۔

"لوازمات کے ساتھ اور ذرا جلدی۔ دو آدمیوں کے لیے۔" گل مجھے چھوڑ نہیں رہا تھا۔ اس کی نیند کا وقت تھا۔ میں نے خالد سے کہا۔

"آپ ذرا اسے سنبھالیے تو میں اٹھوں۔"

انہوں نے گل کو مجھ سے لے لیا اور اس سے باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ جب سے خالد انگلینڈ سے آئے تھے ان سے ملاقات کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ اس لیے میں پہلے سے ہی ٹرالی میں کھانے پینے کی چیزیں تیار رکھتی تھی صرف چائے بنانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اب بھی چائے تو فوراً بن گئی۔ ٹرالی تیار تھی مگر بوستان غائب تھا۔ مجبوراً مجھے ہی چائے لے کر ڈرائنگ روم میں جانا پڑا۔ خالد اپنے مہمان سے باتیں کر رہے تھے گل خالد کی جیب ٹٹول رہا تھا۔ پھر خالد کی آواز آئی۔

"لیجیے آ گئی چائے۔ میں نے کہا تھا نا۔ ہمارے ہاں ایک چراغ ہے چراغ الہ دین جیسا۔ وہ ہر کام لمحے بھر میں کر دیتا ہے۔" پھر میری سمت مڑ کر بولے۔ "ادھر آئیے۔ میں آپ کو اپنے مہمان سے ملواؤں۔ میری ان سے شرط لگی تھی۔ ان کو یقین نہیں تھا کہ پانچ منٹ میں چائے آ سکتی ہے۔ بہت مشتاق تھے یہ آپ سے ملنے کے۔"

"آپ نے میری غیر ضروری تعریفیں کی ہوں گی حسب عادت۔" میں نے کہا۔ اور ڈائننگ ٹیبل سے شکر دان اٹھا کر ٹرالی میں رکھتے ہوئے نظر اٹھائی۔ سامنے بجلی سی چمکی۔ مہمان کی نظریں میرے اوپر ہی جمی ہوئی تھیں۔ شکر دان میرے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر جا گرا۔ لمحے کی چوتھائی میں وہ میرے پاس لپک کر آیا۔ میں اور عثمان ایک دوسرے کے سامنے یوں کھڑے تھے جیسے پتھر کے مجسمے۔ بے جان اور ساکت۔ دل کی دھڑکن اور خون کی روانی رک گئی تھی۔ وقت تھم گیا تھا۔ خالد نے قریب آ کر سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔

"بھابی کیا ہوا؟"

میں نے گل کو لپٹا لیا۔ سب کچھ دھندلا رہا تھا۔

"یہ تم کو کہاں ملی؟" عثمان خالد سے پوچھ رہا تھا۔

"کون؟ یہ گل کی امی؟ میں نے تم کو بتایا تو تھا اماں بی نے۔" خالد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دیں۔

"میں پوچھتا ہوں یہ تم کو اب وہ کہاں ملی؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں تو انگلینڈ سے آیا ہوں تو یہ یہیں تھیں۔"

عثمان نے گل کو مجھ سے چھین لیا اور اسے چومنے لگا۔ خالد فوراً سمجھ گئے اور باہر چلے گئے۔ شدت گریہ سے میں کچھ بول ہی نہ سکی۔

"تم کیوں چلی آئی تھیں۔ میرا انتظار تو کرتیں۔" عثمان شکوہ کرنے لگا۔ "میری موت کا تم کو یقین تھا۔ اسی لیے نہیں رکیں۔"

میں اسے کیا جواب دیتی۔ ابھی تو میرا سانس ہی قابو میں نہ تھا۔

عثمان نے بتایا کہ اس نے ریڈیو پر اعلان کرائے، اخبار میں اشتہار دیے۔ مگر میری کوئی اطلاع نہ ملی۔ عثمان کی صحت کے بعد سب کو میری فکر تھی۔ ثمامہ کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا تھا اور چچی اماں خود کو کوستی رہتی تھیں۔ ان ہی کی وجہ سے میں گھر بدر ہوئی تھی۔ ثمامہ کو عثمان نے بتایا تھا کہ وہ مجھ سے مل کر آیا ہے اور اب کسی قیمت پر مجھ سے دست بردار نہیں ہوگا۔ اس بات کا ثمامہ نے بہت اثر لیا۔ اور کئی دن تک جھگڑا ہوتا رہا۔ عثمان کو اعتراف تھا کہ میں مختلف اور منفرد تھی صحت پانے کے بعد تو وہ بے قراری سے میری تلاش کرتا رہا۔ اپنی پہلی محبت۔ کھوئی ہوئی محبت کو۔ پھر بات بڑھتی گئی اور ثمامہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔ تنگ آ کر عثمان نے اس کو طلاق دے دی۔ ادھر اکلوتے بیٹے کی بربادی اور مجھ پر کیے ظلم زیادتی کے احساس نے چچی اماں کو بیمار ڈال دیا۔ پوتے کو نہ دیکھ سکنے کا غم اور بہو کے دربدر ہونے کا صدمہ چچا وہ بے انہیں کھا گئے۔ وہ اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ ٹرالی میں پڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ گل عثمان کی گود میں سو گیا تھا اور باتوں کا شکوے شکایتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔

اف اس سرد رات میں ہم نے کتنی باتیں کہیں۔ شاید تمام عمر کا قرض چکا دیا۔ میں گل کو اپنے کمرے میں لٹانے آئی۔ تو عثمان بھی میرے ساتھ تھا۔ مجھے

یوں محسوس ہوا۔ جیسے ابھی ابھی کہیں سے حنا کی مہک اٹھی ہے۔ گلاب اور موتیا کے ہار میرے جسم کو مس کر رہے ہیں۔ اور جیسے میں ابھی ابھی دلہن بنی ہوں۔ میرے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ آنکھوں میں سہانے خواب جھلملانے لگے اور ہونٹوں پر پُرشوق مسکراہٹ جم کر رہ گئی۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا؟ عثمان مجھے کونسی دنیا کی سیر کرانے لگا تھا۔ جہاں قوسِ قزح کے لہریے مجھے اپنے دوش پر لیے پھر رہے تھے۔ میں کتنی ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ سارے دکھوں کا بوجھ اتار کر نئے سرے سے خوشیوں کا پرچم اٹھائے میں بے گناہی کا تاج پہنے اتراتی پھر رہی تھی۔ ہاں یہ ہے میرا نصیب انعام صلہ جزا۔ جس میں ایک نوزائیدہ بچے کی مانند پاک صاف، اچھوتی تھی اور کسی کو اس میں شک نہ تھا۔

اچانک عثمان نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تھمایا۔ "یہ اعتبار اس فیصلے کی جانب ہے۔ خدا کو گواہ بنا کر میرے سوال کا جواب دینا۔" عثمان جذبات سے عاری آواز میں کہہ رہا تھا۔ "تین سال پہلے تم غائب ہوئی تھیں۔ مگر تین سال نہیں۔ صرف تین ماہ کی روداد جاننا چاہتا ہوں۔ اپنے ایمان کی گواہی میں سچ سچ بتانا خالد سے تمہاری تعلق کی نوعیت کیا ہے؟"

کہیں بجلی گری۔ [illegible] تصورات کا محل زمین بوس ہوا تھا۔ قوسِ قزح میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میرا تاج ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر گیا۔

"یوں مجھے نہ دیکھو میں تم سے تمام عرصے کی نہیں صرف ان تین مہینوں کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں جب سے خالد آیا ہے۔ تم جیسی بھی ہو اپنی نادانی، غلطیوں اور ظلم کے کفارے کے طور پر قبول کر لوں گا۔ لیکن مرد ہوں۔ ایسی مشکوک صورت حال کو کیسے گوارا کروں۔ شک تو چٹانوں میں سوراخ کر سکتا ہے میں تو ایک کمزور انسان ہوں۔"

"تو یہ تم تھے عثمان۔ تم بھی مجھے [illegible] بہت دعوا تھا تمہیں کہ تم مجھے منفرد مختلف اور وفا کی دیوی سمجھتے ہو۔ مگر یہ کیا ہے؟ طوفانوں کا مقابلہ کرتے کرتے جب میرے بازو شل ہو گئے اور کنارے کی آس ہوئی تو تم میرے بازو توڑنے آ گئے۔ جب میں معاف کر دینے کے اصول کو اپنانے پر تیار ہو گئی۔"

"مجھے معلوم ہوا تھا۔" عثمان برابر بول رہا تھا۔ میری دلی کیفیت سے بے خبر۔ "کہ خالد ابھی شادی پر تیار نہیں۔ کسی خاص لڑکی سے شادی کرے گا۔ اس کی بہن نے خود مجھے بتایا تھا اور یہ بھی میں نے سنا تھا کہ خالد کی والدہ نے کسی کو بیٹی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ بے چاری دکھی ہے۔ کیا وہ دکھی لڑکی تم تو نہیں؟ اور ابھی جب میں نے اس سے شادی کے بارے میں پوچھا تو وہ ٹال گیا۔ کیوں؟ اس راز سے پردہ اٹھانا چاہیے۔ کیا واقعی۔ تم اس کے لیے اہم ہو؟ اور اصل بات۔"

تو یہ تھا میرا غرور۔ میرا افتخار۔ [illegible] بکھر کر مجھے زندہ درگور کیا تھا اور کس قدر اذیت اٹھا کر میں اسے [illegible] اپنا بھرم رکھتی رہی اور کسی کو نہیں۔ عثمان کے سامنے صفائی پیش کرتی؟ اس نے مجھے بچپن سے آج تک کتنا پہچانا تھا؟ خالد نے اسے بلایا تھا۔ تحریری معافی نامہ لکھ کر۔ سعدیہ لے اور وہ آیا۔ تو میرے لیے الزام کی نئی فہرست [illegible] نفرت ہو جاتی ہے اور مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ عثمان سے نفرت۔ شدید نفرت۔

یہ جو [illegible] دن ہم اماں بی کی گود میں سر رکھے کانپتی لرزتی رہتی ہوں۔ اماں بی کی نصیحتوں کو ان سنا کرتی رہتی ہوں۔ مجھ پر یہ دن [illegible] راتیں قیامت بن کر گزرتی ہیں۔ [illegible] طوفان کی طرح [illegible] رہتی ہیں۔ میں نے صفائی پیش کرنے سے انکار کرکے ایک مرد کی انا کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ خود کو [illegible] بچا لیا ہے۔ مرد صفائی مانگتا ہے اپنے غرور مردانگی کی تسکین کے لیے۔ اماں بی! میرا غرور جو پاش پاش ہوا ہے اسے کون سمیٹے گا۔ اب میں [illegible] ریزہ ریزہ ہو کر عبرت کا سامان بننے کے لیے تیار نہیں۔ میری ہستی کو پیروں تلے روندنے کی کوئی سازش اب کامیاب نہیں ہو گی۔ میرا اللہ پر یقین ہے۔ اسی کا بھروسا ہے مجھے۔ نیک پارسا والدین کی آغوش میں

تربیت ملی ہے مجھے۔ چچا ابا جیسے بے لوث، بے غرض عظیم انسان نے پرورش کی ہے میری۔ میں اتنی بے حقیقت بھی نہیں ہوں۔ عثمان نے بھی مجھے آج تک نہیں پہچانا۔ مجھے اس سے شکوہ نہیں۔ میں نے اس لیے اس کے سامنے صفائی پیش نہیں کی کہ مجھے ذرا بھی پرواہ نہیں کہ وہ مجھے کیا سمجھتا ہے۔

خالد آپ کیوں قسمیں کھا رہے ہیں کہ آپ نے شادی کے ذکر کو اس لیے ٹالا تھا کہ اگلے دن بی اماں کے لیے سعدیہ کے بارے میں سوال اٹھائیں گے اور میری تعریف تو آپ کرتے ہی رہتے ہیں۔ بھولوں کی تعریف کے لیے خاص وقت اور خاص لوگ تو مقرر نہیں۔ افسوس میری وجہ سے آپ سعدیہ کو کھو بیٹھے ہیں۔ میں نے اب جو فیصلہ کیا ہے اس پر پچھتانے کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ نہیں اس سے بہتر فیصلہ شاید میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ میں جذبات کی غلام نہیں ہوں۔ نسائیت کی تذلیل گوارا نہیں ہے مجھے۔ کتنے دن گزر گئے مجھے ہوش نہ تھا۔ نہ رات دن کی پہچان رہی۔

اندھیروں میں [illegible] کرتے کرتے تھک گئی۔ دل و دماغ [illegible] مہمان تھا۔ وہ عثمان کا بیٹا تھا نا۔ میں نے خود عثمان کے لہجے کی [illegible] اختیار کی [illegible] لیا اب اس کی کوئی بھی نشانی اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں ہوں۔ [illegible] اس کا حق ہوتا۔ تو میں وہ بھی اسے [illegible] اس کا کوئی تحفہ کوئی احسان میرے لیے ذلت کا ہار [illegible] گا۔ پتا نہیں دن رات کیا سوچتی رہتی ہوں۔ اماں بی کی پناہ نہ ہوتی تو پاگل ہو گئی ہوتی۔ ذہن میں خیالات کا ہجوم رہتا ہے۔ پھر بھی کسی خلا کا احساس نہیں چھوڑتا۔ خلا جو میری ذات میں [illegible] زندگی میں قدم جما رہا ہے۔ اوہ میرے خدا رحم کر۔

"اماں بی! آپ کو [illegible] ہے؟" خالد نے اندر آکر [illegible] سے کہا۔ میں تو اپنے خیالات میں کھوئی رہتی ہوں۔ پتا نہیں اماں نے کیا بات کی تھی۔ وہ بہت سنجیدہ ہو گئے تھے۔ میری حالت اور انجام سے رنجیدہ تھے۔ میرا وقار مجروح ہوا تھا، وہ خود کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔

"آپ اندر آجائیے۔ کوئی غیر یہاں نہیں ہے۔" خالد کسی سے کہہ رہے تھے۔ بمشکل پلکیں کھول کر میں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ شاید میں بہت بیمار تھی۔ کمزوری سے آنکھیں بھی نہیں کھل پاتی تھیں۔ "کچھ دنوں سے یہی حالت ہے۔ کھانا پینا چھوٹ گیا ہے۔ وہ ابھی بھی نہیں [illegible]" خالد کسی کو بتا رہے تھے۔ "میں تو بہت پریشان ہوں۔ ان کا خون میری گردن پر ہو گا۔ گناہ گار نہ ٹھہرایا جاؤں۔"

"گھبراؤ نہیں خالد! اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔" خالد کے پیچھے [illegible] کھڑے تھے۔ ہر سمت اجالا سا ہو رہا تھا۔ شاید میں بہت دن [illegible] سو رہی تھی۔

"زندگی پر اعتماد بحال ہو جائے تو دوا کی ضرورت نہیں رہتی۔" سکندر کی نظروں میں آج بھی وہی چمک۔ وہی لپک ہے۔ انتظار کی [illegible] آنکھیں اس روشنی سے چکا چوند ہو رہی ہیں۔

مجھے زندگی پر اعتماد بحال کرنے میں چند دن لگے۔ وہ سکندر کی کوشش تھی۔ اماں بی کا پیار۔ خالد بہت خوش تھے۔ میں جو ٹوٹ کر بکھر گئی تھی تو لوگ مجھے توڑ کر لطف لیتے رہے۔ سنگ زنی کرکے جشن [illegible] اب میں خود [illegible] آہن بن گئی ہوں۔ مجھے یہ [illegible] مضبوطی سکندر کے اعتماد نے دی ہے۔ ان کا انتظار پر یقین تھا۔ میں ہی کھو گئی تھی۔ میں [illegible] منزل تھی۔

"آپ کو معلوم ہوا؟ میں نے عثمان کے لیے حقارت کا لہجہ کیوں اختیار کیا۔ اس لیے کہ میں جس کی عزت نہ کروں، جس سے نفرت کروں۔ اس کو عزت کے الفاظ نہیں دے سکتی۔ جو میرے کردار پر حرف گیری کرے اس کے لیے میرے دل میں جگہ نہیں۔ میں خواہ کتنی بار ٹوٹ کر جڑی ہوں مگر کردار پر ایک رگڑ۔ کوئی نشان نہیں بنا۔ عثمان کی بدگمانی گئی تو سکندر کو بھلا دیا اور اب سکندر کو اپنانے کے بعد عثمان کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ وفا کی سرشت۔ وفا کے اصول میری ذات کا خلا پر ہو گیا ہے۔"

★